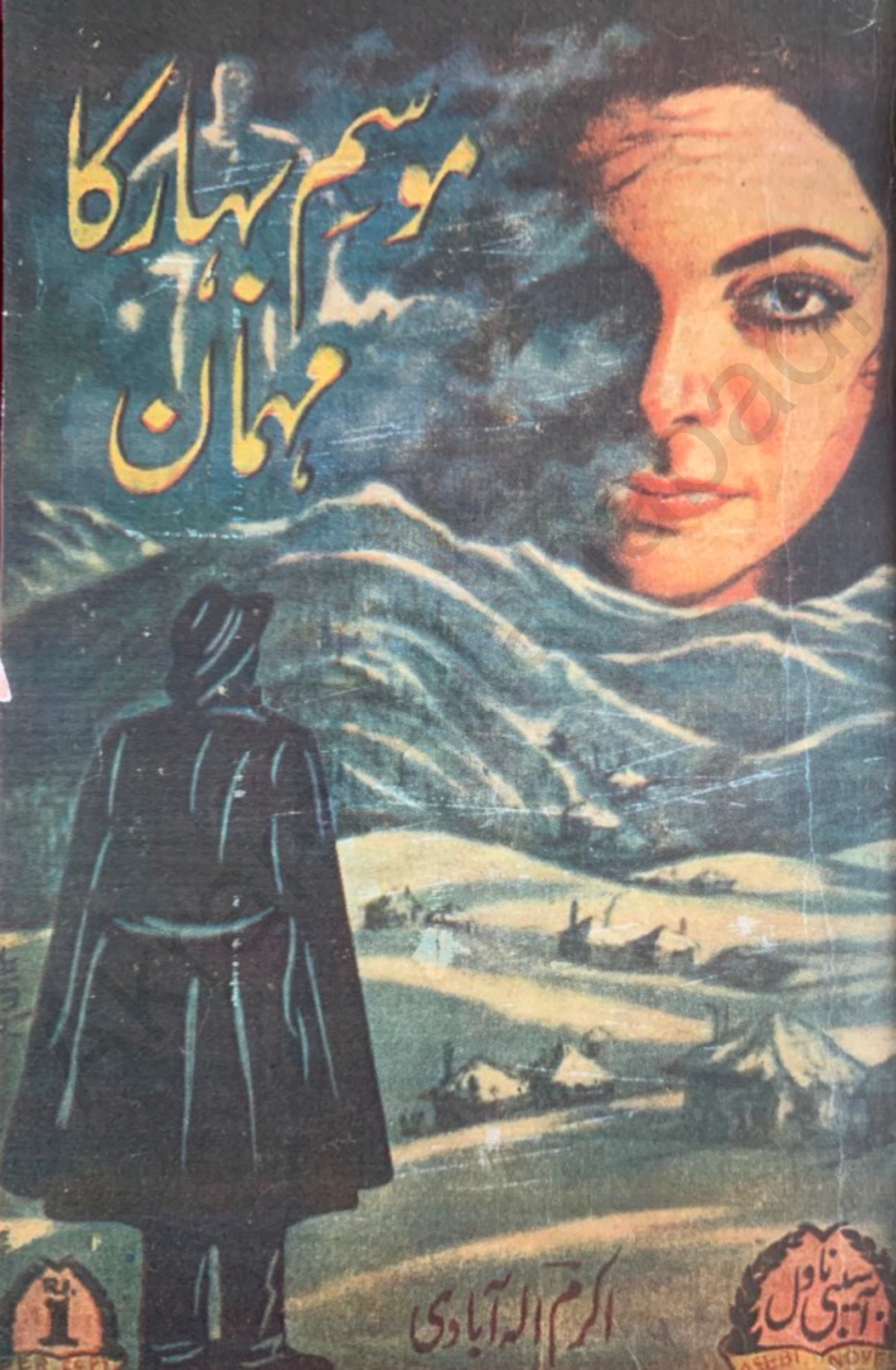

موسم بہار کا
مہمان
اکرم الہ آبادی
آسیبی ناول

جاسوسی دائرہ سیریز

موسم بہار کا مہمان

اکرم الہ آبادی

Akram Allahabadi

فرحت پبلیکیشنز۔ممبئی۔انڈیا

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں۔اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پرنٹر:۔۔۔۔۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

انتساب

بھائی سعید خان کے ماموں جناب چاند خاں کے
نام ۔ جن کی بزرگانہ شفقتیں ہماری اس نئی کوشش
میں بڑی معاون ثابت ہو رہی ہیں ۔ حالانکہ یہ صحیح ہے
کہ انھیں ادب سے زیادہ کبوتروں سے عشق ہے ۔

اکرم

Akram Allahabadi

وادیٔ قاچار

موسم سرما نے دور تک پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہسار کو دودھ جیسی سفید برف کی موٹی چادر سے ڈھانک دیا تھا۔ اور اب صرف کہیں کہیں ان اونچے درختوں کی پھننگیں نظر آ رہی تھیں جو برف پگھلنے کے بعد دیوقامت سائے نظر آنے لگے تھے۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا اور برف باری اب بھی جاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان زمین پر ننھے ننھے سفید پھول برسا رہا ہے۔ کہر گہری تھی اور اس کے پار دیکھنا ایسا ہی مشکل تھا جیسے کسی گدلے پانی کی تہ میں گہرائی تلاش کی جائے۔ البتہ اونچی پہاڑیوں کے دھندلے خاکے ضرور نظر آ جاتے۔ کیوں کہ بہر حال وہ اتنے ٹھوس اور بڑے تھے کہ کہر کا انجماد انھیں ہضم نہیں کر سکتا تھا۔

استرا خان کی پہاڑی کے دامن میں وادیٔ قاچار بھی برف کی اس کہر میں اس طرح ڈھکی ہوئی تھی جیسے کوئی بہت بڑا جہاز سمندر میں ڈوب گیا ہو۔

موسم سرما کے آغاز کے بعد اگر کوئی اس رستے سے گزرنے کی جرأت کر سکتا تھا تو وہ خان احمد نوازی تھا۔ جو وادی کے اس پار شورال پہاڑی کے ایک نشیبی ٹھہراؤ پر اپنے پتھر کے بنے ہوئے مکان میں صرف ایک نوکر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے بوڑھا تھا۔ کیوں کہ اس نے وادی کی دو نسلیں دیکھی تھیں۔ مگر اس ۱۰۵ برس کی عمر میں بھی اسے بوڑھا کہنا اس کی توہین تھی۔ آج بھی وہ تندرست نوجوانوں کو اپنے بازوؤں میں بھر کر اگر ٹکرا دیتا تو ان کے بھیجے نکل پڑتے۔ لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی شیرنی کا ہی دودھ پیا ہوگا۔ اور لوگ تو بے ضرورت بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں۔ ویسے اس اطراف میں خونی بھیڑیوں کے کئی قبیلے آباد تھے۔ لیکن شیر کا ذکر کبھی نہیں سنا گیا۔

Akram Allahabadi

استرا خان کا راستہ اسی لیے مخدوش تھا کہ ایک بار دور سے شہر سے آئے ہوئے سیاحوں کے ایک قافلے کے دو آدمی جو سیر کی دھن میں اس پہاڑی پر بھٹک گئے تھے، کئی دن سے برف باری کے سبب بھوکے پھرتے بھیڑیوں کی خوراک بن گئے تھے۔ اور تب سے کئی بار ان بھیڑیوں نے جو آدمی کا مزیدار خان چاٹ چکے تھے، وادی کے ان لوگوں پر بھی دانت صاف کر دیے تھے جو شاید یہ سمجھ کر ادھر سے گزرتے تھے کہ کم از کم پڑوسی پڑوسی کا لحاظ ضرور کرتا ہے۔ اور جب پڑوسیوں نے پڑوسی کا بالکل لحاظ نہیں کیا تو باقی لوگوں نے برف باری کے دنوں میں ادھر سے گزرنے کے تصور سے بھی توبہ کر لی۔ مگر ان توبہ کرنے والوں میں خان نواز نہیں تھا۔ اس نے تو اپنی گاڑی برف پر گھسیٹنے کے لیے ایسے خونخوار کتے پال رکھے تھے جو بھیڑیوں کو چیر ڈالیں۔ حالاں کہ تعداد میں وہ صرف نصف درجن ہی تھے اور ان میں سے ایک تو خان کا لاڈلا تھا جو کبھی گاڑی میں نہ جوتا جاتا۔ اس نے اس کا نام ''دُلہاب'' رکھا تھا۔ دلہاب دراصل پہلے وادی کے ایک شہ زور قسم کے آدمی کا نام تھا۔ اور چار سال پہلے جب خان نواز نے اسے موسم بہار کے ایک میلے کے موقع پر اپنے بازوؤں پر اٹھا کر پھینک دیا تھا تو وادی کے قانون کے مطابق اسے اس بات کا حق مل گیا تھا کہ شکست خوردہ حریف کو ذلیل کرنے کے لیے اگر وہ چاہے تو اپنے کتے کا نام اس کے نام پر رکھ سکتا ہے۔ اور خان نواز نے یہی کیا۔ اسے دلہاب سے اتنی ہی نفرت تھی۔ کیوں؟ یہ ایک راز تھا جسے دلہاب جانتا تھا یا وہ خود۔

۱۰۵ سال کی عمر میں بھی خان نواز کی آخری بیوی کو مرے بمشکل بیس سال ہوئے تھے اور تب سے اس نے کوئی نئی بیوی نہیں کی تھی۔ کیوں کہ یہ بیوی اپنے پیچھے ایک اولاد چھوڑ گئی تھی۔ اور وادی کے لوگوں کا دستور تھا کہ اولاد ہو جانے کے بعد کوئی دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بے اولاد ہوتے ہوئے چاہے تو سو کر لے۔ خان نواز استرا خان پر موسم سرما میں لومڑیوں اور خرگوش کا شکار کرنے جایا کرتا تھا۔ لومڑی کی کھال اچھے داموں بکتی تھی اور خرگوش کا گوشت وہ خود بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ وہ اپنی برف کی گاڑی پر ہی شکار کو جاتا تھا۔ جس میں

پانچ کتے جوتے جاتے تھے۔ یہ گاڑی کمان کی شکل میں ساگون یا شیشم کی لکڑی کی بنی ہوتی تھی۔ پیچھے کی سمت گدے دار نشست ہوتی اور درمیان میں ایک بڑا سا صندوق نما حصہ جس میں شکار کیے ہوئے جانور ڈال دیے جاتے تھے۔ وہ بھری ہوئی دو رائفلیں اپنے دائیں بائیں رکھتا اور کمر میں ریوالور کے علاوہ کلہاڑا بھی لگا رہتا، جو اتنا تیز ہوتا کہ کسی حملہ آور بھیڑیے کے سر پر اس کا ایک ہی وار اسے دو پلوں میں تقسیم کر دینے کے لیے کافی تھا۔

بہر حال خان نواز کی شخصیت اس خطر پسندی کے لیے مشہور تھی۔ اور ویسے بھی وہ اپنی تنہائی پسند طبیعت کی وجہ سے ایک پراسرار قسم کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔

وہ وادی میں کبھی نہ آتا، سوائے موسم بہار کے اس میلے کے جو سال کے سال برف کے پگھلنے کے دنوں کے شروع ہوتے ہیں وادی میں لگتا تھا۔ اس دن وادی کی تمام دوشیزائیں برف جیسی سفید پوشاکیں پہنتیں اور تمام نوجوان چمڑے کے گرم لبادے جن کے کالر اور آستینوں پر سیمور کی گوٹ ہوتی پہنتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کا قومی لباس تھا اور جس نوجوان کے پاس کم از کم ایک لبادہ نہ ہوتا وہ بہت غریب اور نکما سمجھا جاتا تھا۔ بوڑھے بوڑھیاں اس دن یا تو میلے میں شریک ہی نہ ہوتے تھے شاید وہ اس بہار کو دیکھ رک اپنی زندگی کی خزاں کو یاد کرنے لگتے یا پھر شریک ہوتے تو ان ہنگاموں سے الگ رہتے جو انگور کی شراب پی کر مست ہو جانے والے نوجوان اچھل کود اور رقص و سرود کی شکل میں برپا رکتے تھے۔ صرف شادی شدہ جوڑے اس دن شوخ اور رنگین لباس پہن کر آتے تھے۔

وادی قاچار کی بستی صدیوں سے شورال اور استرا خان کی بلند برفیلی پہاڑیوں کے دامن میں بسی ہوئی تھی۔ کبھی وسطی منگولیا کی ایک حملہ آور قاچار قوم کے لشکر نے اس خوب صورت اور شاداب وادی میں پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہ صدیوں پیچھے کی بات ہے۔ لیکن وہ لوگ ان دنوں کے برفستانی سفر کی دشواریوں کے پیش نظر آگے نہ بڑھ سکے۔ اور ان کی بڑی تعداد یہیں سے اپنے وطن لوٹ گئی۔ بس تھوڑے لوگ جو پیچھے محاذ جنگ پر مفتوح قوم کی کچھ خوب صورت

لڑکیوں سے شادیاں کر چکے تھے، یہیں بس گئے تھے۔اور تب سے وادی قاچار کی آبادی بڑھتی رہی۔یہاں تک کہ اب وہ کئی صدیوں کے بعد تیئس ہزار سے بھی زیادہ پہنچ چکی تھی۔

قاچاری، تنومند، خوبرو، گورے اور جوشیلے ہوتے تھے اور کچھ اس مقام کی آبو ہوا نے بھی ان کے رنگ اور صحت کو نکھار دیا تھا۔ان کی عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ حسین ہوتی تھیں البتہ مردوں کے چہرے جفاکشی اور سیاحت پسندی کے اثرات سے کرخت اور دبی رنگت کے ہو جاتے تھے۔ان کے بچے برف کی گیندوں سے کھیلتے ہوئے خود بھی برف کی گیندیں معلوم ہوتے تھے۔

وادی کا وہ حصہ جو قریب سے بہہ کر نکلنے والی زمردندی کے کنارے واقع تھا، کاشت کے لیے بہت زرخیز تھا۔لیکن برف باری کے دنوں میں اس پر بھی برف کہ تہیں جم جاتی تھیں اس لیے یہ موسم وادی کے لوگوں کے لیے آرام کا موسم ہوا کرتا تھا۔سال کے تین مہینے ان کے مکانوں کی چھتیں، بستی کے راستے، پلوں اور کنوؤں کے سائبان برف سے ڈھکے رہتے تھے۔اور اس کے بعد ایک مہینہ جو برف پگھلنے کا مہینہ ہوتا تھا۔اس موسم میں برف پگھلنے کے بعد سوکھے درختوں پر بھی کونپلیں نکل آتی تھیں اور ساری وادی لالہ زار بن جاتی۔

اس موسم میں ان کے قہوہ خانے خصوصاً پُر رہتے تھے۔برف باری شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے دور کے شہروں کے سیاح بھی یہاں آجایا کرتے رہتے تھے۔اس جنت نظیر مقام پر موسم سرما گزارنے کے لیے آنے والے لوگ زیادہ تر دول مند ہی ہوتے اور وادی کے لیے اس موسم میں وہی کسی قدر آمدنی کا ذریعہ ہوتے تھے۔پوری وادی میں ایسے چار ہوٹل تھے جو اس موسم میں سیاحوں سے آباد ہو جایا کرتے تھے۔اور ان میں سب سے شاندار اور بڑا ہوٹل کاشانہ تھا جو بستی کے سرے پر ذرا اونچائی پر استرا خان کے بالکل سامنے واقع تھا۔یہ ہوٹل پتھر کی مضبوط دیواروں کا بنا تھا۔اور تقریباً سو سال سے اپنی جگہ قائم تھا۔پہلے چند سالوں تک یہ بستی کے سردار کی قیام گاہ رہی۔اس کے بعد یہاں کے لوگوں نے اپنے سردار کے لیے جسے وہ خان

قاچار کہتے تھے، زمردندی کے کنارے اونچائی پر ایک دوسری شان دار قیام گاہ اور کورٹ بنا دیا تھا۔ تب سے خان قاچار وہیں رہتا تھا۔ ویسے وہ بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے بہت کم نکلتا تھا۔ البتہ اس کے دو لڑکے، جو خان اکبر اور خان اصغر کہلاتے تھے، اپنے بڑے بالوں والے برفستانی گھوڑوں پر بیٹھ کر کبھی کبھی بستی میں آجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں تعلیم یافتہ اور کافی مہذب تھے۔ خان قاچار نے ان میں سے ایک کو تو انگلینڈ بھیجا تھا اور وہاں سے آکر وہ قاچاریوں کے لیے ضروری تعلیم کے اسکولوں کا ہیڈ مقرر کر دیا گیا تھا۔ خان اصغر البتہ ذرا اوباش قسم کا نوجوان تھا اور وہ کوئی کام کرنے کے بجائے حکومت جتانا زیادہ پسند کرتا تھا۔ وادی کی لڑکیاں بھی اسے پسند نہیں کرتی تھیں، کیوں کہ وہ ہر روز ایک نئی محبوبہ تلاش کرتا پھرتا تھا۔

جنگجو قاچاری اب بڑے امن پسند ہو گئے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ جھگڑوں کو نظر انداز ہی کر دیتے تھے۔ پھر بھی خان نواز، دلباب، خان اصغر جیسی دو چار ہستیاں اب بھی ایسی تھیں جن میں وحشیانہ پن بدرجہ اتم موجود تھا۔

برف باری کے دنوں کی نکھلائی ہوئی کہر آمیز شاموں میں، جن میں بستی کے مکانوں کی چھتوں میں ابھری ہوئی چمنیوں کا دھواں اور ملگجاہٹ پیدا کر دیتا تھا، کافی رومان انگیز سماں پیش کرتی تھیں۔ کہر کی تہہ سے آسمان پر مغربی جھکاؤ میں ہلکی سرخی کانپتی نظر آتی اور اس کا عکس پہاڑوں کی چوٹیوں پر جب پڑتا تو وہ بہت بھلی معلوم ہوتیں۔

بستی کی لڑکیاں اس منظر کو دیکھنے کے لیے اپنے دو منزلہ مکانوں کے چھجوں یا ایک منزلہ مکانوں کے باہر چبوتروں یا ٹیلوں پر دو دو چار چار کے جتھے بنا کر کھڑی ہو جاتیں۔ گرم لبادوں میں چھپے ہوئے ان کے کھلے ہوئے شفاف اور خوب صورت چہرے ایسے معلوم ہوتے جیسے رنگین چائنا کلے (China Clay) کی گڑیوں کو کپڑے پہنا کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ ان کے کھنکتے قہقہوں سے نوجوانوں کے دل مچلنے لگتے۔ لیکن یہاں کی تہذیب اتنی آزاد نہ تھی کہ کوئی علی الاعلان کسی سے اظہار عشق کر بیٹھتا۔ اور کوئی اگر ایسی جرأت کر بھی بیٹھتا تو کوڑوں سے اس

کی ننگی پیٹھ پر زخم ڈال دیے جاتے ۔البتہ وادی کے لوگ مہمانوں سے بڑی محبت اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے اور ان کی خاطر داری میں کوئی کمی یا کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

موسم بہار کا مہمان

بس ایسی ہی ایک سہانی شام تھی، کجلائی ہوئی۔ جب وادی کی لڑکیاں موسم بہار کے گیت گا رہی تھیں۔ اور روما، کاشیانے کے دومنزلہ کے چھجے پر کھڑی ہوئی کہر میں ڈھکی ہوئی استراخان کی پہاڑی کے اس ڈھلوان کو تک رہی تھی جس کا نظارہ اسے حسین خوابوں کی ایک ان دیکھی دنیا میں پہنچا دیا کرتا تھا۔ وہ کاشانہ ہی کی رونق نہ تھی بلکہ ساری بستی کی رونق تھی۔ ساری بستی میں اس سے حسین لڑکی ایک نہ تھی۔ اور وادی قاچار کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ اسی کے چرچے ہوتے۔ حتیٰ کہ خان اکبر بھی جو ولایت سے واپسی کے باوجود ابھی تک کنوارا تھا، اسے شریک زندگی بنانے کی آرزو دل میں لیے بیٹھا تھا۔ لیکن روما ان سب کے لیے پراسرار تھی۔ اس نے وادی کے کسی نوجوان کو کبھی اتنا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اس کے سامنے کسی قسم کے جذبات کا اظہار کر سکے۔ اور اس کے بوڑھے باپ نے، جو کاشانے کا مالک تھا، اس سلسلے میں اسے پوری آزادی دے رکھی تھی کہ وہ جسے اپنے لیے موزوں سمجھے منتخب کر لے۔ خان اصغر جب بھی کاشانے میں آتا، اسے بھوکی نظروں سے گھورتا رہتا۔ لیکن وہ اسے دیکھ کر اس طرح نفرت سے منہ پھیر لیتی جیسے واقعی اس کا وجود قابل نفرت ہو۔ ایک بار جب خانا صغر نے اپنے ایک گرگے کے ہاتھوں اس تک اپنے بھڑکتے جذبات کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی تھی تو اس نے کہلا بھیجا تھا کہ ''تم خنزیر ہو''۔ یہ قاچاریوں کی بدترین گالی تھی۔ کیوں کہ سور سے وہ اتنی ہی گھن اور نفرت کرتے تھے۔ اس کے بعد خان اصغر کی کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ حسن و وقار کے اس زندہ مجسمے سے آنکھ ملا سکتا۔ اس نے کاشانے میں آنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ کاشانے کے انتظام اور مہمان سیاحوں کی خاطر تواضع میں وہ بھی اپنے بوڑھے باپ، خان شہباز، کی مدد کرتی تھی۔ ویسے چار چھ ملازم اور بھی تھے۔ مگر جس دن سے موسم سرما شروع ہوتا وہ شام کے اوقات

میں کوئی کام نہ کرتی۔بس اوپری منزل کے چھجے پر چلی جاتی اور وہاں سے سامنے استرا خان اور اس کے دامن میں برف سے ڈھکے ہوئے ان چنار کے درختوں کو ایک ٹک دیکھا کرتی جو وادی تک پہنچنے والے راستے کے راہبر تھے۔وہ آدھے سے زیادہ تو برف میں دب ہی جاتے تھے اور باقی جو چوٹی اوپر نکلی رہتی اس پر روئی کے گالوں کی طرح برف کا غلاف چڑھ جاتا۔پھر بھی وہ بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔

استرا خان اور بستی کے درمیان ایک ٹھنڈے شفاف پانی کا چشمہ بھی بہتا تھا۔جو سانپ کی طرح بل کھاتا دور جا کر زمرد سے جا ملتا۔اس چشمے کے اوپر ایک کمان دار پل بنا ہوا تھا۔جو برف سے ڈھک جانے پر دور سے روئی کا کھلونا نظر آتا۔بستی تک آنے کے لیے اس پل سے گزرنا ضروری تھا اور شام کے وقت اگر بستی کے نوجوانوں کا کوئی گروہ اس طرف نہ آتا تو لڑکیوں کے جتھے پل پر سیر کرنے آجاتے تھے۔یہ پل صرف بیس گز لمبا اور دو گز چوڑا تھا۔اسے بستی کے لوگ جنت کا پل کہا کرتے تھے۔کیوں کہ برف چھٹ جانے کے بعد اس چشمے کے آس پاس بہار ہی بہار نظر آتی۔رنگ برنگے خوشنما پھولوں کے تختے دور تک بچھے چلے جاتے اور بستی کے بچے ان کے آس پاس کی ہری ہری گھاس میں تتلیاں پکڑتے پھرتے۔دوشیزائیں ان پھولوں کو اپنے نرم ریشمی بالوں میں لگاتیں اور بوڑھے گلدانوں میں سجاتے۔

☆☆☆☆☆☆

روما کی آنکھوں میں یکا یک ایک چمک سی پیدا ہوگئی۔اور اس کا چہرہ کھل اٹھا۔شاید چار دنوں سے اس کی بے قرار نگاہیں جس کے لیے استرا خان کے راستے پر لگی ہوئی تھیں، وہ آرہا تھا۔موسم بہار کا مہمان۔جو ہر سال برف باری شروع ہونے کے ساتھ خونخوار بھیڑیوں کے مسکن استرا خان کے راستے سے بغیر کتوں کی گاڑی کے آیا کرتا تھا۔وہ وادیٔ قاچار کے لوگوں کے لیے ایک معمہ تھا۔اور خود روما کے لیے بھی۔لوگ یہ تو جانتے تھے کہ وہ استرا خان کے اس پار

کے کسی شہر سے آتا ہے، لیکن اس کے بارے میں کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔ وادی کے لوگ اسے موسم بہار کا مہمان کہتے تھے۔ کیوں کہ وہ کئی سالوں سے اسے ہر موسم سرما میں آتے دیکھتے تھے اور جب برف پگھلنے لگتی اور سوکھے درختوں میں سبز کونپلیں پھوٹ آتیں تو وہ اچانک ایک دن چلا جاتا۔ اس طرح کہ کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ ایک روما ہی نہیں، وادی کی نہ جانے کتنی لڑکیاں موسم سرما کے شروع ہوتے ہی اس کی راہ دیکھا کرتی تھیں۔ اور اکثر تو اسی کے لیے تفریح کے بہانے اس جنت کے پل پر اپنی شامیں گزارنے چلی جایا کرتی تھیں۔

استرا خان کے ڈھلوان پر برف کے کہر سے ایک انسانی سایہ ابھرتے دیکھ کر روما کے جوان سینے میں دل کی دھڑکن تیز ہو گی۔ یہ وہی روما تھی جس کا دل بستی کے کسی حسین سے حسین اور با حیثیت نوجوان کے لیے کبھی نہ دھڑکتا تھا۔ اور یہ وہی روما تھی جس نے خان قاچار کے لڑکے خان اصغر کو خنزیر کہہ کر ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اس مہمان کے لیے نہ جانے کیوں وہ خود کو بے بس محسوس کرتی۔ اس قدر بے بس کہ بعض اوقات تو اس کا دل تڑپ تڑپ کر فریاد کرا اٹھتا کہ وہ اس کی طرف ایک محبت بھری نظر سے دیکھتا کیوں نہیں؟ وہ اتنا بے حس اس قدر پتھر کیوں ہے؟ لیکن آج یہ سب سوچنے کا دن نہ تھا۔ آج کا دن تو اس کے لیے سال بھر کے شدید انتظار کے بعد نصیب ہونے والا موسم بہار کا پہلا دن تھا۔ اس کی زندگی میں ہر سال یہ موسم اسی دن سے شروع ہوتا تھا، جس دن ان جانے دیس کا یہ اجنبی مہمان استرا خان سے گزر کر وادیٔ قاچار میں قدم رکھتا۔ وہ چند لمحوں تک ایک ٹک اسے دیکھتی رہتی۔ کہر کی دھند میں وہ انسانی سایہ رفتہ رفتہ بڑا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ ڈھلوان پر اترتا ہوا جنت کے پل کے قریب آ رہا تھا۔ کاشانے کے اس چھجے سے استرا خان کا ڈھلوان صاف نظر آتا تھا۔ لیکن نیچے کا پل نشیب میں چھپ جاتا۔ وہ انسانی سایہ اب اور صاف نظر آنے لگا۔ وہی ہر سال کے جیسا ایک ہی لباس۔ یا ممکن ہے وہ صرف ایک ہی قسم کے لباس پہنتا ہو۔ ہلکا سا سیاہ لبادہ۔ جس کے کالر اور آستیوں پر سیمور کی باریک گوٹ ہوتی اور سر پر سفید بالوں والی ٹوپی۔ ایک گرم سیاہ پتلون کے ساتھ وہ لومڑی کی

کھال کے جوتے پہنے ہوتا جن کے تلوے سپاٹ اور چکنے ہوتے۔اس نے اس کے خوبصورت ڈیل سے ہی پہچان لیا کہ وہی ہے۔اور اس کے سوا ہو ہی کون سکتا تھا۔برف باری کے اس طوفان میں جب ہواؤں کی چیخیں تک خوفناک ہو جاتی تھیں اور کون جرأت کر سکتا تھا کہ استرا خان پر قدم رکھے۔ایک خان نواز کی ذات تھی۔لیکن وہ بھی اس موسم میں کتوں کی گاڑی بغیر استرا خان کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔اس نے سوچا کہ پہلے بھاگ کر بابا کر خبر کر دے تا کہ وہ اس کے کمرے کا آتش دان روشن کرا دے۔برف باری سے اور استرا خان کی خون کو منجمد کر دینے والی برفیلی سطح سے گزر کر آنے والے کو فوراً ہی دہکتے آتش دان کی گرم گرم آنچ کی ضرورت ہوگی۔

"بابا...بابا....وہ آ گیا۔بابا...وہ آ گیا۔" وہ چیختی ہوئی کاشانے کے لکڑی کے زینے سے جب بھاگ کر اترنے لگی تو اس کے قدموں کی چاپ سے نیچے ایک شور مچ گیا۔

کاشانے کا مالک بوڑھا خلیل، جس کی عمر ۶۵ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی، دراصل زیادہ تمباکو نوشی کی وجہ سے اپنی بینائی کھوتا جا رہا تھا۔اور اب اسے سامنے کی شکلیں دھندلی دھندلی سی نظر آیا کرتیں۔پھر بھی وہ نہ تو چشمہ استعمال کرتا اور نہ کام سے جی چراتا۔ مہمان سیاحوں کی خاطر داری میں وہ اب بھی پہلے کی طرح منہمک رہتا۔پچھلے سال ایک ڈاکٹر مہمان آیا تھا، جس نے اسے عنایتاً ایک موٹے شیشے کی عینک بھی دے دی تھی۔لیکن وادیٔ قاچار میں تو سو برس کے بوڑھے بھی عینک کبھی استعمال نہ کرتے تھے۔پھر ۶۵ سالہ خان خلیل اس میں اپنی توہین کیوں نہ محسوس کرتا۔اس نے اس عینک کو مہمان کا دل رکھنے کے لیے صرف ایک پہن کر دوسرے دن ہمیشہ کے لیے اسے اپنے صندوق میں بند کر دیا تھا۔اور یہ ایک دن بھی اس پر مصیبت کی طرح گزرا تھا۔اس بہت سی دور کی چیزیں قریب نظر آتی تھیں۔اور انھیں اٹھانے کے لیے جھکتے ہوئے وہ گر پڑا تھا۔ایک بار اس نے ایک نوکر کو غصے میں طمانچہ مارا تھا۔عینک سے یہ دیکھ کر کہ وہ اس کے بالکل قریب سامنے کھڑا ہے۔لیکن اسے ایک مقامی دوست کی پھبتی

سنکر واقعی افسوس ہوا تھا کہ "خلیل خان بوڑھاپے میں اتنی بھی نہ پی لینی چاہیے کہ ہوا کو تھپڑ مارنے لگو۔بس پھر دوسرے دن سے اس نے وہ عینک کبھی نہیں نکالی۔

وہ اس وقت شہری مہمانوں کے اس گروپ کی خدمت میں لگا ہوا تھا جو پچھلے ہفتے ہی یہاں آیا تھا۔اس وقت بادل پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہی جم کر برف بن چکے تھے۔لیکن راستے صاف تھے۔ ویسے بالعموم سیاح اس سے قبل ہی یہاں پہنچ جایا کرتے تھے۔ یہ گروہ ایک خوبصورت لڑکی،ایک بوڑھے ڈاکٹر،ایک ادھیڑ عمر کی تندرست عورت اور تین ادھیڑ عمر اور جوان ساتھیوں پر مشتمل تھا۔وہ سب شریف با حیثیت اور مہذب لوگ معلوم ہوتے تھے۔ڈاکٹر ان اب کا بزرگ معلوم ہوتا تھا۔کیوں کہ اس کی بات وہ سب ہی مانتے تھے۔ پہلے ہی دن وہ جب کاشانے میں آئے تھے،انھوں نے اوپری منزل کے کمرے دیکھنے کے بعد اس بات پر ضد کی تھی کہ استرا خان کی طرف رخ رکھنے والا چھجے دار کونے کا کمرہ انھیں دے دیا جائے۔لیکن بوڑھے خلیل نے صاف انکار کر دیا تھا۔ان میں سب سے زیادہ بضد وہ لڑکی تھی جسے بوڑھے ڈاکٹر نے زلفی کے نام سے پکارا تھا۔وہ محض ضد میں اس کمرے کا زیادہ سے زیادہ کرایہ دینے کو تیار تھی،کیوں کہ اسے اپنے قیام کے لیے وہی سب سے زیادہ پسند تھا۔مگر خلیل نے کہہ دیا کہ اگر وہ اس کے ہزار روپے بھی دیں گے تو نہیں مل سکتا۔وہ ایک ایسے مہمان کے لیے مخصوص ہے جو کئی سالوں سے اس موسم میں یہاں آتا ہے اور اس کمرے میں ٹھہرتا ہے۔اس نے کہا۔

"ہم لوگ تو یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جیسے یہ کمرہ ہے ہی اسی کا۔"

لیکن ڈاکٹر کے سمجھانے سے کہ وہ آنے والے مہمان کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لے گا کہ کچھ دنوں وہ کمرہ ہمارے پاس رہنے دیا جائے،خلیل خان کچھ نرم پڑنے لگا تو روما باپ پر بگڑ گئی۔وہ بھی اس وقت وہاں موجود تھی اور ڈاکٹر صاحب کا ایک ساتھی اسے ایسی نظروں سے تک رہا تھا جیسے وہ اس دنیا کی پیداوار ہی نہ ہو۔کم از کم اپنے شہر میں تو اس نے کنول کی طرح سرخ اور کھلا ہوا ایسا خوبصورت چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ویسے اس کی ساتھی لڑکی،زلفی،بھی کچھ کم

حسین نہ تھی، لیکن اس شہری حسن میں وہ تازگی وہ نکھار نہیں تھا، جو روما کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر پایا جاتا۔

''یہ خودغرضی ہے، پاپا، کہ ہم ایک موسم کے مہمانوں کی خوشنودی کے لیے اپنے پرانے مہمان کو ناراض کردیں۔ وہ کمرہ کسی قیمت پر بھی کسی کو نہیں دیا جائے گا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''ہاں ہاں، ڈاکٹر صاحب، مجھے سخت افسوس ہے کہ میں ایسا نہ کرسکوں گا۔۔'' اس کے باپ نے بیٹی کی ہی تائید کی اور وہ بہت کم اپنی بیٹی کی بات ٹالا کرتا تھا۔ ایک چہیتی اولاد تھی اس کی بس۔

''تمہیں بھی ضد نہیں کرنی چاہیے، زلفی۔ یہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے ٹھنڈے لہجے میں زلفی کو ہی سمجھایا۔ اور پھر کوئی ڈاکٹر کے سامنے چوں نہ کرسکا۔

لیکن جب پانچ دن گزر گئے اور وہ اجنبی مہمان پھر بھی نہ آیا تو زلفی اور اس کے ساتھیوں نے خلیل سے پھر اصرار کرنا شروع کردیا کہ تمہارا مہمان شاید اس سال نہیں آئے گا۔ وہ کمرہ ہمیں دے ہی دو۔ اس دن تو خلیل ٹال گیا۔ مگر دوسرے دن جب خود ڈاکٹر نے اس سے وہی بات کہی تو اسے یہ بہانہ بنانا پڑا کہ دو چار دن اور انتظار کرلیا جائے۔ اگر نہ آیا تو میں دے دوں گا۔ مگر یہ کہتے ہوئے خود اس کا دل اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کررہا تھا کہ وہ نہ آئے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ چاہے شدید سے شدید طوفان ہی کیوں نہ برپا ہوجائیں۔ چاہے پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے تودے ہی کیوں نہ لڑھکنے لگیں مگر وہ ضرور آتا تھا۔

اور آج پھر اس وقت، جب شام کا سرمئی جھٹ پٹا کہر کی دھند سے اور گہرا ہوتا جارہا تھا، وہ اوپری منزل کے برآمدے میں دہکتی انگیٹھی کے چاروں طرف بید کی کرسیوں پر بیٹھے خلیل سے یہی بحث کررہے تھے۔ خلیل آیا تو تھا ان سے رات کے کھانے کے لیے یہ پوچھنے کہ اگر وہ کوئی خاص چیز پکوانا چاہتے ہوں تو اس کا بھی انتظام کیا جائے۔ لیکن زلفی نے پھر وہی

بات چھیڑ دی۔

''آج سات دن ہو چکے ہیں۔آخر اب کیا حرج ہے تمہیں وہ کمرہ دینے میں۔''

اس نے ہی گفتگو کی ابتدا کی۔

''یہ بات نہیں ہے، مادام۔بلکہ دراصل اس کمرے کے لیے ایک بار ہی وہ اتنی رقم چکا چکا ہے کہ شاید اپنی ایک نسل تک ہم یہ کمرہ اسی کے لیے مخصوص سمجھنے پر مجبور رہوں گے۔''

''کیا وہ بہت امیر آدمی ہے کوئی؟''ڈاکٹر نے بیچ میں دخل دیا۔

''ہم قاچاری کسی کی ذاتیات سے اس قسم کی دلچسپی نہیں رکھتے۔ویسے وہ کچھ عجیب سا آدمی ہے، جسے شاید کوئی نہیں سمجھ سکا ہے۔''بوڑھے خلیل نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''کوئی بوڑھا آدمی ہے کیا؟''ڈاکٹر کے ایک ساتھی نے دستانے اتار کر انگیٹھی سے ہاتھ تاپتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔میں اسے دیکھتے دیکھتے بوڑھا ہوا جا رہا ہوں لیکن میں نے کئی سالوں میں اس میں کوئی فرق نہیں پایا۔وہ اب تک اتنا ہی خوبصورت اور جوان ہے جس قدر میں نے پہلے پہل اسے دیکھا تھا۔''

''ہوتا ہے۔ایسا ہوتا ہے۔''ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔''بعض لوگ اپنی تندرستی اسی طرح سے برقرار رکھتے ہیں کہ وہ کبھی بوڑھے ہی نہیں ہوتے۔''اس نے بتایا۔

''تو کیا انھیں موت بھی نہ آتی ہوگی؟''ڈاکٹر کا دوسرا ساتھی جو اس سے کسی قدر بے تکلف معلوم ہوتا تھا، ہنس کر پوچھ بیٹھا۔

''ایسے لوگ عموماً مرتے بھی اسی طرح ہیں کہ کسی کو توقع نہیں ہوتی۔بس ہارٹ فیلیر یا کوئی...''ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''آپ لوگ بھی کیا غیر ضروری باتیں لے بیٹھے۔''ڈاکٹر کے پاس والی نشست پر بیٹھی ہوئی ادھیڑ عمر عورت بول اٹھی۔

Akram Allahabadi

''خیر خیر۔'' ڈاکٹر نے بات ٹالی۔اور پھر خلیل سے مخاطب ہوگیا۔''ہاں تو اب کیا کہتے ہو تم؟ وہ تو آیا نہیں نا۔''

''خدا جانے۔یا شاید موسم ہی جلدی شروع ہوگیا ہو۔''خلیل تذبذب کے عالم میں بولا۔

''اچھا ایسا کرو تم وہ کمرہ ہمیں دے دو۔تمہارا مہمان جس دن بھی آگیا، ہم اسے خالی کردیں گے۔'' ڈاکٹر نے بڑے نرم لہجے میں اس سے فرمائش کی۔

''جی...مگر...وہ....''

''اب تو انکار نہیں کرنا چاہیے انھیں۔'' ادھیڑ عمر عورت نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔ویسے اسکا تخاطب خلیل سے ہی تھا۔

''لیکن...لیکن یہ ایک بے اصولی ہوگی۔''

''اصول کو وادیٔ قاچار میں لے کر کیا چاٹنا ہے۔اور پھر تم تو بزنس مین...'' ڈاکٹر کے ساتھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اچھا...مگر...''خلیل کہنے ہی جارہا تھا کہ اسے روما کی آواز سنائی دی۔وہ شاید ہال میں پاپا، پاپا، چیختی ہوئی اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

''وہ آپہنچا، جناب۔''خلیل خوش ہوکر بولا۔''وہ جب آتا ہے تو یہ اسی طرح چیخ کر دوڑتی ہے۔''

''ہونہہ۔''زلفی نے منہ ٹیڑھا کرلیا۔

''ذرا ہم بھی دیکھیں کون ایسا عجیب مہمان ہے وہ۔''ڈاکٹر نے اس کی پرواہ کیے بغیر ہنس کر کہا۔

''غالباً آپ لوگ اسے یہاں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔''خلیل برآمدے کے جال کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔اور غیر ارادی طور پر وہ لوگ بھی اس کے پیچھے اٹھ کر جالی تک آگئے۔

"وہ...وہ دیکھیے....وہ آ رہا ہے... پل کی طرف۔"خلیل نے انگلی سے کہر کی دھند کی طرف اشارہ کیا۔

وہ انسانی سایہ، جو دھند میں ایک سیاہ خاکے کی طرح نظر آ رہا تھا، ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھامے آہستہ آہستہ پل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کبھی وہ برف کے سفید ذرات کی بارش میں چھپ جاتا اور کبھی صاف نظر آنے لگتا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"لیکن یہ پیدل ہی اس پہاڑی سے اترا ہے شاید۔" ڈاکٹر کے ساتھی نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔

"واقعی، اس موسم میں کتوں کی گاڑی بغیر برف پر سفر کرنا ناممکن ہے۔" ڈاکٹر نے اس کی تائید کی۔

"لیکن، جناب، وہ ہمیشہ بغیر گاڑی کے ہی آتا ہے اور اسی خطرناک استرا خان سے آتا ہے جہاں آدم خور خونخوار بھیڑیوں کے غول کے غول برف سے دبی جھاڑیوں میں دبے شکار کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ خان نواز تو ایک بار بتا رہا تھا کہ ان بھیڑیوں نے اب فوجیوں کی طرح برف میں گڑھے بنا کر چھپنا بھی سیکھ لیا ہے۔"

"یہ خان نواز کون ہے؟" ڈاکٹر نے اس کی طرف گھوم کر پوچھا۔

"وادیٔ قاچار کا سب سے ضدی اور خونخوار آدمی۔ صرف وہی اس موسم میں استرا خان پر اپنی کتوں کی گاڑی میں ریچھوں، لومڑیوں اور خرگوش کا شکار کھیلنے جاتا ہے۔ مگر ایک نہ ایک دن وہ ان بھیڑیوں کا لقمہ بن جائے گا، جن کے دانت بہت تیز ہیں۔"

"تو کہیں وہی نہ ہو۔" ادھیڑ عمر عورت نے پلٹ کر کہا۔

"جی نہیں۔ اس کی چال کم از کم اتنی باوقار نہیں جتنی اس اجنبی کی ہے۔ اور پھر وہ بستی میں نہیں آتا ہے۔"

"تم اسے اجنبی کہتے ہو، حالاں کہ تمہارا کہنا ہے کہ وہ کئی سالوں سے یہاں آتا ہے

اور تمہارے یہاں ٹھہرتا ہے۔"

"وہ تب بھی ہمارے لیے اجنبی ہے، جناب۔اس لیے کہ آج تک ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جان سکے ہیں۔وہ کسی سے زیادہ گفتگو ہی نہیں کرتا۔"

"کیا تم اس کا نام بھی نہیں جانتے؟" زلفی نے اس بار خواہ مخواہ سوال کیا۔حالاں کہ وہ اس تذکرے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔وہ ویسے بھی دیکھنے میں کافی مغرور معلوم ہوتی تھی۔

"صرف پہلی بار جب اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام لکھا تھا، میں نے دیکھا تھا کہ وہ شہاب ہے۔مگر ہمیں کسی مہمان، میرا مطلب ہے گاہک کو کبھی اس کے نام سے پکارنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔اس لیے وہ نام رجسٹر تک ہی محدود رہ گیا ہے۔"

"تو کیا تم مہمانوں کو ان کے کمروں کے نمبروں سے پکارتے ہو؟" ڈاکٹر کا بے تکلف ساتھی ہنس کر بول اٹھا۔

"اوہ نہیں، جناب، مہمانوں کے ساتھ ہم ایسی بدتہذیبی سے کیسے پیش آسکتے ہیں۔ ہم تو انھیں، جناب، جناب عالی، مادام اور محترمہ جیسے ناموں سے ہی پکارتے ہیں۔" خلیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔مگر اس کے لہجے میں طنز نہ تھا۔کئی سالوں سے کاشانے کا انتظام چلاتے ہوئے اسے مہذب لوگوں سے ان کے مذاق کے مطابق گفتگو کرنے کا پورا تجربہ ہو گیا تھا۔اور بعض اوقات تو وہ ان سے بھی زیادہ مہذب معلوم ہونے لگتا۔

"وہاٹ نانسنس۔" زلفی اچانک ٹیلی کی طرف دیکھ کر بولی۔اور وہ بھی گفتگو روک کر ٹیلی کی طرف دیکھنے لگے۔ٹیلی پر وادی کی کچھ لڑکیاں موجود تھیں جو اسے دیکھ کر دونوں طرف سمٹ گئی تھیں اور پھر سکتے کے عالم میں اسے اپنے درمیان سے گزرتے دیکھ رہی تھیں۔وہ سر کو ذرا جھکائے ان کے درمیان سے گزر رہا تھا کہ شاید ان میں سے ایک لڑکی کو چکر سا آگیا اور وہ ٹیلی کی مینڈ سے پیچھے لڑھک کر چشمے کے پانی میں گر پڑی۔لیکن اس مہمان کو اس کی خبر بھی نہ تھی

کہ عالم محویت میں ایک لڑکی پر کیا گزر گئی۔اس کی سہیلیاں اسے پانی سے نکال رہی تھیں۔

اور پھر مکانوں کے دریچوں میں اور چھجوں پر وادی کی لڑکیوں کے چہرے ابھرنے لگے۔ہوائیں ایک عجیب سی سرگوشی کر رہی تھیں، جیسے بہت سی آوازیں کانا پھوسی کے لہجے میں کہہ رہی ہوں۔''وہ آ گیا۔.....وہ آ گیا۔''

''یہ لڑکیاں اس میں اتنی دلچسپی کیو لے رہی ہیں؟''زلفی پھر بڑبڑائی۔

''اس لیے کہ وہ ان مین دلچسپی نہیں لیتا۔''بوڑھا خلیل ادب سے بولا۔''وادیٔ قاچار میں بہت سے نوجوان اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں،لیکن وہ اسے صرف اس لیے نقصان نہیں پہنچاتے کہ وہ خود کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔''

''یہ کتنے برس سے یہاں آتا ہے۔''ڈاکٹر نے یونہی اس سے سوال کیا۔

''میرے اس ہوٹل خریدنے کے دوسرے سال سے ہی۔یا ممکن ہے اس سے پہلے بھی آیا ہو۔لیکن اس کا علم اگر ہوگا تو خان نواز کو ہوگا۔''

''کیوں ہم تو کہتے ہو کہ وہ بستی میں ہی نہیں آتا ہے؟''

''وہ بھی عجیب ضدی آدمی ہے، جناب۔دراصل پہلے کاشانے کا مالک وہی تھا۔یہ عمارت جس میں آپ موجود ہیں اندازاً سو سال پرانی ہے۔شاید ۲۴ یا ۲۵ سال پہلے ایک دن اس نے خود ہی یہ ہوٹل مجھے بیچ دیا تھا۔نہ جانے کیوں۔یا شاید آبادی سے اس کا دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔وہ تبھی سے شورال کی پہاڑی پر رہنے چلا گیا۔

''اس میں بھی کوئی ضد رہی ہوگی۔''ڈاکٹر نے پلٹ کر کرسی پر آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ بھی لوٹ کر اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے۔اور خلیل انگیٹھی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''اس میں کسی ضد سے زیادہ ایک المناک سانحے کو دخل ہے،ورنہ وہ اتنا مردم بیزار آدمی نہ تھا کہ وادی کی طرف رخ کرنا ہی چھوڑ دے۔''

''بیوی مر گئی تھی کیا اس کی؟''ادھیڑ عمر خاتون نے ٹوک کر پوچھا۔

''جی نہیں، بلکہ....بلکہ....''

''شاید کوئی ایسی بات ہے جو تم ہمیں نہیں بتانا چاہتے۔''

''وہ ایک راز ہے، جناب۔لیکن وادیٔ قاچار والوں کے لیے آپ لوگوں سے چھپانا تو کوئی ضروری نہیں ہے۔لیکن....؟''

''اطمینان رکھو، تمہارا راز ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ یہاں کوئی نہ جان سکے گا اسے۔''زلفی نے بھی اب دلچسپی لی۔

''یہ کیا حماقت ہے۔آخر ضروری بھی کیا ہے کہ ہم اسے جان لیں۔''ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔

''کریز، ڈیڈی، کریز۔میں تو کسی ادھوری بات کو سن کر اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتی جب تک کہ پوری نہ سن لوں۔''زلفی نے اپنے چہرے کو انگیٹھی کی طرف جھکاتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہوگا کہ اس وقت آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔وہ اب ہوٹل میں داخل ہوا ہی چاہتا ہے اور میں اگر اس کا استقبال نہ کروں گا تو یہ ایک غلط سی چیز ہوگی۔''

''لیکن وہ کہانی تو ادھوری ہی رہ گئی۔''زلفی نے پھر ٹوکا۔

''ممکن ہے رات کر فرصت مل جانے پر سنا سکوں۔اچھا، کھانے میں کسی خاص چیز کے اضافے کی ضرورت ہو تو کہلا بھیجیے گا۔''یہ کہہ کر وہ تعظیماً ذرا سا جھکا اور واپس لوٹ گیا۔

''بوڑھا ضرور کوئی دلچسپ داستان شروع کر رہا تھا، ممی۔''زلفی نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم تو بس پیچھے ہی پڑ جاتی ہو ایک چیز کے۔''ادھیڑ عمر عورت نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''خالہ بی، انھیں تو کسی اخبار کا رپورٹر ہونا تھا۔آپ نے ناحق انھیں ڈاکٹری کی تعلیم

دلائی ہے۔'' ڈاکٹر کے دوسری طرف بیٹھا ہوا جوان سا آدمی، جس کے بھرے ہوئے چہرے پر ابھی تک لڑکپن برستا تھا، بول اٹھا۔

''کم از کم آپ کے روپیہ آنہ پائی والے سبجکٹ سے تو بہتر ہی ہے۔'' زلفی نے اسے گھور کر جلے ہوئے انداز میں کہا۔

''اکنامکس کی پوزیشن آج کل بہت اہم ہوگئی ہے، میڈم۔''

''ٹونہہ، اپنے منہ میاں مٹھو۔''

''بھئی تم لوگوں کا اکٹھا ہونا اجتماع ضدین کے برابر ہے۔'' ڈاکٹر کو بولنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ازلی دشمنی لے کر پیدا ہوئے ہو۔''

''کون؟ میں دشمن؟ نہیں، خالو بابا، یہ میری دشمن ہیں۔''

''یہ خود ہوں گے۔'' زلفی اور چڑ گئی۔

''مگر، بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی آخر۔'' ادھیڑ عمر عورت مسکرا کر بولی۔ اور وہ شاید اس جملے کا مطلب سمجھ گئے، کیوں کہ اس پر کسی قدر شرمائی ہوئی سی زلفی اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اور لوہے کی سلاخ سے خالہ بی کا بھانجہ انگیٹھی کی آگ کرید نے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

عجیب داستان

کہر کی دھند سے چھٹتا ہوا وہ سایہ برف سے ڈھکی ہوئی چھتوں والے مکانوں کے درمیان سے کچلی ہوئی برف کی پگڈنڈی پر گزرتا کاشانے کی طرف آرہا تھا۔راہ چلتے بستی کے لوگ خصوصاً نوجوان اسے دیکھ کر رک جاتے۔اور لڑکیاں تو اس کے سامنے سے گزر جانے کے بعد بھی کھڑی اسے دیکھتی رہ جاتیں۔بعض لوگ اسے دیکھ کر برے برے منہ بنا رہے تھے۔اور ظاہر ہے کہ اس کا سبب ان کے دلوں میں چھپی ہوئی وہ جلن ہوگی جو بستی کی لڑکیوں کو اس نوجوان سے اس قدر دلچسپی لیتے دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔لیکن اس نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔وہ کبھی سامنے اور کبھی پیچھے دیکھتا،راستے سے گزر کر کاشانے پر پہنچ گیا۔

جیسے ہی وہ کاشانے کے نچلے ہال میں داخل ہوا،روما کا دل دھک رہ گیا۔وہ بڑی بے چینی سے دروزے ہی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ایک سال کے طویل انتظار کے بعد وہ آج اسے پھر دیکھ رہی تھی۔اس کا دل اچھل اچھل کر منہ کو آنے لگا۔جب اس نے اسے اپنی نظروں کے سامنے کاشانے میں قدم رکھتے ہوئے دیکھا۔وہ واقعی بہت خوب صورت آدمی تھا۔کشمیری سیب جیسا چہرے کا رنگ اور نقوش اتنے حسین کہ اگر روما جیسی لڑکی بھی دل ہی دل میں اس کے قریب ہوجانے کی آرزو لیے تڑپ رہی تھی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔وہ چھ فٹ یا اس سے کچھ کم قامت کا چوڑے سینے والا مضبوط آدمی نظر آتا تھا۔ہلکے ہلکے بھورے رنگ کے لبادے کے ساتھ اس نے ہاتھوں پر سفید دستانے پہن رکھے تھے۔اس کے پیروں میں لومڑی کے کھال کے جوتے تھے۔اس کی پلکیں کم جھپکتی تھیں۔اور جب وہ اپنی آنکھیں پوری کھول کر کسی طرف دیکھتا تو شفاف جھیلوں کی طرح اس کی آنکھیں نکھری ہوئی اور بڑی پاکیزہ نظر آتیں۔روما کھوئے ہوئے انداز میں اس کا استقبال کرنے کے بجائے اسے ایک ٹک دیکھتی

Akram Allahabadi

رہ گئی۔اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔اور دل تو شاید سینے سے نکل پڑنا چاہتا ہو۔اس نے ایک نظر روما کی طرف دیکھا اور ایک خفیف سی دل آویز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔شاید وہ اس حسین برفستانی دوشیزہ کے جذبات سے بالکل ہی نا واقف نہ ہوگا۔

''کاشانہ اپنے عزیز مہمان کا استقبال کرتا ہے۔'' خان خلیل خود آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچتے ہوئے کسی قدر جھک کر بولا۔

لیکن وہی جواب۔بس ایک خفیف سی مسکراہٹ، جو نہ جانے کتنے دلوں کو جیت لیا کرتی تھی۔اس کھوئے ہوئے انداز میں روما آگے بڑھی۔اس کے قدم کانپ رہے تھے۔اس نے چاہا کہ تعظیماً مہمان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لے۔اور اسے اس کے کمرے تک پہنچا دے۔مگر ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے فرط جذبات سے اس کا ہاتھ بھی کانپنے لگا۔خدا جانے اتنے دنوں بعد اس مہمان کو دیکھ کر کیوں اس کی یہ کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔

''شکریہ۔اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔آپ چابی لے لیجیے۔'' وہ بڑے پر وقار لہجے میں، مگر آہستہ بولا۔مگر روما کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی خوابناک لہجہ میں کہیں بہت دور سے بول رہا ہو۔اور اس کے کانوں کو محض اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہو۔وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ اس نے کی بورڈ پر سے چابی اتار لی اور ایک نظر مہمان کے چہرے پر ڈال کر خوشی سے اس کے ساتھ ہو لی۔بوڑھا خلیل بھی کچھ دور تک ساتھ چلتا رہا۔

''آپ کا کمرہ ایک ہفتے پہلے ہی صاف کر کے ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا تھا۔'' وہ بتا رہا تھا۔

''ہُم۔''مہمان نے سر جھکائے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

''کچھ لوگ اس کمرے کے لیے بری طرح ضد کر رہے تھے۔لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔میں نے کہا آپ ہزاروں روپے بھی دیں گے تو وہ کمرہ نہیں ملے گا۔وہ ہمارے ایک معزز مہمان کے لیے مخصوص ہے۔''خلیل نے کسی قدر فخریہ لہجہ میں کہا۔

Akram Allahabadi

''شکریہ۔''مہمان کی ترنم میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

اور روما کا دل چاہا کہ اگر وہ کچھ اور نہیں کہتا تو کم از کم بار بار شکریہ ہی ادا کرتا رہے۔ کتنی آرزو تھی اسے کہ وہ کم از کم ایک بار ہی اس سے کھل کر گفتگو کر لے۔

''اور جناب، آتشدان میں صندل کی لکڑیاں بھی ڈال دی گئی ہیں، تا کہ سیلی ہوئی برفیلی ہوا آپ کو زیادہ ناگوار نہ گزرے۔''

''شکریہ۔''مہمان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ یقین مانیے، آپ کے بستر میں ایک بھی کھٹمل نہ ہوگا۔ میں نے ٹیسو کے پھول بھی کھڑکی میں لٹکا دیے ہیں۔'' آپ جانتے ہیں ٹیسو کے پھولوں کی بو سے کھٹمل کس طرح بھاگتے ہیں۔'' روما نے بھی سلسلۂ گفتگو چھیڑ دیا۔

''آپ لوگ بڑا خیال رکھتے ہیں میرا۔ کاش میں ہمیشہ یہاں رہ سکتا۔'' وہ نرم اور کھنکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ یہ ایک ایسا جملہ تھا کہ روما کے دل کی دھڑکن اسے سنتے ہی تیز ہو گئی اور چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا۔ خصوصاً جملے کا دوسرا ٹکڑا۔ اے کاش، اے کاش ایسا ہو جائے۔ اس کا دل اندر سے تڑپ کر چیخا۔ کاش تم ہمیشہ کے لیے ہی یہاں رہ جاؤ۔ رہ جاؤ نا، اجنبی۔ لیکن دل کی آواز زبان تک نہ آسکی۔ اور آتی بھی کیسے؟ آج تک اس اجنبی مہمان نے اسے کوئی موقع ہی ایسا نہیں دیا تھا جو وہ اس سے دو منٹ اکیلے میں باتیں ہی کر سکے۔ دل کی بات کہنا تو کافی دیر کی بات تھی۔ اور پھر اس کا رویہ اتنا عجیب تھا کہ وہ ایسی جرأت بھی نہ کر سکتی تھی۔ جب وہ اوپر پہنچے تو ڈاکٹر اور اس کے ساتھی انگیٹھی کے گرداب تک بیٹھے ہوئے تھے۔ زلفی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ خان خلیل اور روما کے ساتھ اس مہمان کو دیکھتے ہی وہ چونک پڑے۔ خصوصاً ڈاکٹر تو اسے بڑی حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ اس وقت برآمدے میں جلنے والی مومی شمع کی ناکافی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آسکتا تھا۔ البتہ جب وہ زلفی کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزر کر اپنے روم کی طرف بڑھنے لگا تو وہ اسے دیکھتی ہی

رہ گئی۔ وہ مردانہ حسن و وجاہت کا ایک نمونہ تھا۔ اور زلفی نے آج تک کوئی اتنا پرکشش مرد نہیں دیکھا تھا۔ حالاں کہ اس وقت بھی وہ اسے پوری طرح نہ دیکھ پائی تھی۔ یہ تو صرف ایک جھلک کا ردِعمل تھا۔

روما آگے تھی، کیوں کہ اسے اسے مہمان کے لیے کمرے کا دروازہ کھولنا تھا۔ درمیان میں وہ چل رہا تھا اور خلیل مؤدب انداز میں اس کے پیچھے تھا۔ زلفی نے بوڑھے خلیل کا بازو پیچھے سے تھام لیا۔ وہ ٹھہر گیا۔

''فرمایئے، مادام؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا یہی ہے وہ؟'' زلفی نے کھوئے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

روما نے اس کے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔

''کیا کوئی چیز درکار ہے آپ کو؟'' روما نے دروازے ہی میں کھڑے ہو کر پوچھا۔

''اس وقت تو تھوڑا سکون چاہتا ہوں۔ ضرورت ہوئی تو پھر تکلیف دوں گا۔'' وہ اپنا سوٹ کیس اپنے بستر ہی پر ڈال کر بولا۔ اور پھر چھجے والی کھڑکی کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔

مومی شمع مہمان کی متوقع آمد کے خیال سے روز شام کو اس کمرے میں روشن کر دی جاتی تھی۔ تاکہ وہ کمرے میں اندھیرے میں داخل نہ ہو۔ قاچاری اندھیرے کو نحوست سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ وہ شمع آج بھی روشن تھی اور کمرے میں اس کی زرد لرزتی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''کیا آپ قہوہ پینا پسند کریں گے اس وقت؟'' روما نے دوسرا سوال کیا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ میں نہیں پیتا۔'' اجنبی مہمان نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

روما نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ اس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ جو

اس کے باہر نکل آنے کے بعد اندر سے بند کر لیا گیا۔

خلیل باہر ڈاکٹر کے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔

''کیا اتنی دور سے یہ مہمان صرف اسی قدر سامان لے کر یہاں آتا ہے؟''

''جی ہاں۔ ویسے بھی وادیٔ قاچار میں ضرورت کی ہر چیز مل سکتی ہے۔ حالاں کہ وہ کسی غیر ضروری چیز سے شوق نہیں کرتا۔'' خلیل بتا رہا تھا۔

''آدمی کیا ہوا، فرشتہ ہو گیا۔'' ڈاکٹر کا بھانجہ بھی بولے بغیر نہ رہا۔ اب زلفی بھی کمرے سے نکل کر یہاں آ بیٹھی تھی۔

''نہ جانے آپ لوگ ایک شخص کی ذاتیات سے اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ حالاں کہ کاشانہ کے مہمانوں میں سے کسی نے آپ لوگوں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔'' اس بار خلیل کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''واقعی یہ ایک تہذیب سے گری ہوئی بات ہے۔'' ڈاکٹر نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کیا۔ ''لیکن اس کی شخصیت بھی کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ دلچسپی لینے کو جی چاہتا ہے۔'' اس نے خود اس کا جواز بھی پیش کر دیا۔

''کیا آپ لوگوں نے ایک بات نوٹ نہیں کی؟'' ڈاکٹر کے بے تکلف ساتھی کے اس جملے نے انھیں چونکا دیا۔

''کون سی؟'' زلفی اور ڈاکٹر کے بھانجے نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''یہ شخص استرا خان کی پہاڑی سے برف باری کے طوفان میں چل کر آیا ہے۔ لیکن کیا اس کے لباس، ٹوپی یا جوتوں پر کہیں بھی برف گری ہوئی ہے؟ کیا اس کے لباس کو کوئی حصہ بھیگا ہوا تھا؟''

''ایں؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے دوہرایا۔ اس بات پر تو میں بھی غور کر رہا تھا۔ یہ کیسے

ممکن ہے کہ برف باری سے گزر کر آدمی آئے اور ایسا معلوم ہو جیسے لباس بدل کر اپنے کمرے سے نکلا ہے۔" ڈاکٹر کے اس جواب پر وہ سب ہی سوچ میں پڑ گئے۔

"مجھے اجازت دیجیے، جناب، بہت کام کرنے ہیں۔" خلیل نے اجازت چاہی۔

"ہمیں وہ کہانی تو سناؤ گے نا، اس راز کی؟" ادھیڑ عمر عورت نے اس سے تقاضہ کیا۔

"مجھے رات کو دس بجے کے بعد مہمانوں سے فرصت مل سکے گی۔" خلیل نے کہا۔

"ہم انتظار کریں گے۔ ویسے بھی ہم لوگ جلدی سونے کے عادی نہیں۔ اور ہاں ممکن ہو تو ایک انگیٹھی اور بھیج دو۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے اور ہم یہیں بیٹھنا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"بھیجے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر خلیل چلا گیا۔ روما پہلے ہی جا چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے اور وادیٔ قاچار پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ دور کہیں کتے بھونک رہے تھے، جن کی سرمائی ہوئی آواز مدھم سنائی دے رہی تھی۔ مگر بدن میں سوئی کی طرح چبھتی ہوئی برفیلی ہوا کے مقابلے میں ڈاکٹر اور اس کے ساتھیوں کی شیخی اب بھی برقرار تھی۔ وہ برآمدے ہی میں بیٹھے تھے۔ اور ایک کی بجائے دو انگیٹھیاں ان کے درمیان رکھی ہوئی تھیں۔ ادھیڑ عمر عورت اور بوڑھے ڈاکٹر نے تو پیروں پر موٹے آسٹریلوی اونی کمبل بھی ڈال رکھے تھے۔ حالاں کہ خان خلیل ان کے سامنے انگیٹھی کے قریب ایک اسٹول پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ اس سردی کو کوئی خاص اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اور انگیٹھی کے پاس ہی نیچے فرش پر بھیڑوں کی بالوں دار کھالوں کا لحاف اوڑھے ایک اندھا سفید ریش قاچاری ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ وہ کوئی غریب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گھنگرو دار ڈفلی تھی، جسے وہ آہستہ آہستہ بجا رہا تھا۔ وہ ایک گیت گا رہا تھا۔ وادیٔ چاچار میں اکثر اس کی زبانی سنا جانے والا

ایک گیت ۔لوگ اسے گیت کے بولوں میں گائی جانے والی ایک داستان سمجھتے تھے ۔لیکن جب وہ اسے گا کر سناتا تو خود اس پر اس قسم کی کیفیت طاری ہوجاتی جیسے وہ ایک حقیقت بیان کررہا ہو۔یا جیسے سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔حالاں کہ اسے اپنی آنکھوں کا نور کھوئے ہوئے بہت سے سال گزر گئے تھے ۔خود وہی کہتا تھا کہ استرا خان کی پہاڑی پر ہی بلندی سے لڑھک کر کسی جھاڑی کی باہر نکلی ہوئی سخت شاخوں سے ٹکرا کر اپنی آنکھیں کھو بیٹھا تھا۔قوزی اپنی ڈفلی پر انھیں گیت سنا سنا کر خوش کرتا اور وہ اسے پیٹ پالنے بھر کا سہارا دے دیتے ۔اس وقت بھی وہ پیٹ کی خاطر ہی خان خلیل کے بلانے پر آیا تھا۔خان خلیل نے اس سے فرمائش کی تھی کہ وہ مہمانوں کے لیے ''طوفان کی رات'' والا گیت سنائے ۔وہ گا رہا تھا۔

''دور دیس سے ایک پردیسی آیا
کوہ قاف کے دیس میں، جہاں چاروں طرف سفید زمین بچھی ہوئی تھی
اور حسین پریاں اس پر رقص کرتی پھرتی تھیں
لیکن وہ قاف کے جنگلی دیوزادوں سے خوبصورت اور پروقار تھا
اس لیے قاف کی سب سے حسین پری
جو بادلوں کے محل میں رہتی تھی
اس پر عاشق ہوگئی
اور وہ دونوں ایک دوسرے کا دم بھرنے لگے
مگر چھپ چھپ کے
وہ تاروں کی چھاؤں میں ملتے
وہ بادلوں کے اس پار کے اندھیرے میں ملتے
وہ ندی کے ٹھنڈے صاف پانی کی لہروں پر ملتے
وہ پر بہار مرغزاروں میں ملتے

مگر چھپ چھپ کے

اور اچانک ایک دن برسوں سے سوئے ہوئے شکاری کتے کی آنکھ کھل گئی

اس نے اپنا کھانڈا اٹھایا

اور ندی کے کنارے پہنچ گیا

محبت کے متوالے اونچائی پر پیار کے گیت گا رہے تھے

جو اس خونخوار ظالم کو نہ بھائے

اس نے اپنی بیٹی کا گلا کاٹنا چاہا

مگر پردیسی کا پیار بزدل نہ تھا

وہ آڑے آ گیا

شیطان کا کھانڈا بلند ہوا

اور ماتھے پر خون کی چادر لیے پردیسی آسمان سے پھسل کر پانی کی گہرائی میں جا گرا

نہ جانے دریا کی تیز موجیں اسے کہاں بہا لے گئیں"

گاتے گاتے وہ رکا۔

"اور اس پری کا کیا ہوا؟" زلفی نے دلچسپی کے ساتھ پوچھا۔

"شیطان کا کھانڈا پھر اونچا اٹھا اور اس نے اپنی معصوم پیاری بیٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔"

"ہائے اللہ۔" ادھیڑ عمر عورت کے منہ سے حیرت و خوف کے لہجے میں نکلا۔

"اس خونخوار بھیڑیے کا راز چھپانے کے لیے ندی کی مٹ کھاتی لہریں ان ٹکڑوں کو بھی بہا لے گئیں۔" اندھے نے اپنا گیت جاری رکھا۔

"کہیں دور

بادلوں کے اس پار

جہاں شام ڈھلے آسمان پر خون چھلکتا ہے
اس نے سوچا اب اس کی بدنامی کو کوئی راز نہیں ہے
لیکن نیلے آسمان کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی ہیں
اور زمین سے بھی دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں
جنھیں اس نے پھوڑ دیا
اور شیطان جب غضب ناک ہوگا
تو وہ اس زبان کو بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دے گا
جو ایک پراسرار داستان کو دوہراتی رہتی ہے
مگر سچائی کبھی مر نہیں سکتی
محبت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا
جسم جدا کیے جا سکتے ہیں
روحیں نہیں
وہ ملتی ہیں تو کبھی جدا نہیں ہوتیں"

"بس بس...بس کرو، بھائی۔تمہارے اس گیت نے تو ہم لوگوں کو بھی اداس کر دیا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ کوئی خوشی کی بات ہوگی۔" ڈاکٹر نے اکتا کر کہا۔

"ڈیڈی، آپ کو ان کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔" زلفی نے اندھے داستان گو کی حمایت کی۔

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں۔مگر...؟" یہ کہتے کہتے وہ خان خلیل کی طرف مخاطب ہو گیا۔"تم جو کہانی بیان کرنے جا رہے تھے؟"

"یہ وہی کہانی ہے۔یہ وہی راز ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے...وہی خان نواز۔یعنی اس کی بیٹی۔"

''مجھے اس بوڑھے خان کا اب ڈر نہیں رہ گیا ہے، اس لیے بتا رہا ہوں۔ بشرطیکہ بات آپ لوگوں تک ہی رہے۔ ورنہ قاچار کے لوگ مرنے کے بعد بھی کسی کو بدنام کرنے سے نہیں چوکتے۔''

''کیا تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں؟''

''نہیں، آپ لوگ شریف لوگ ہیں۔ آپ پر کیوں بھروسہ نہ ہوگا۔''

''تو پھر بتا دو نا۔ اس قدر تکلف کیوں کر رہے ہو؟'' زلفی بچوں کی طرح خنخرے کرنے لگی۔

''اچھا سنیے، مادام۔''

''کیا کر رہے ہو، خان خلیل؟'' اندھے نے گھبرا کر اسے ٹوک دیا۔

''مجھے کہنے دو، قوزی۔ یہ راز مدت سے میرے اور تمہارے سینوں میں گھٹ رہا ہے۔ میں اسے اور چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔''

''وہ... وہ مجھے مار ڈالے گا، خلیل۔''

''مارنے اور جلانے والا خدا ہے۔ ہم بیوقوفوں کی طرح اس سے خوف کھاتے رہے ہیں۔''

''تم جانو۔'' اندھا قوزی یہ کہہ کر خاموش ہو رہا۔

''یہ بے رحم آدمی کی داستان ہے، جناب، جو مجھ سے بہتر قوزی آپ کو سنا سکے گا۔'' خان خلیل نے کہا۔

''ہم تمہیں انعام دیں گے، قوزی۔ ہمیں سناؤ نا وہ قصہ۔'' زلفی نے اصرار کیا۔

''یہ میری زندگی کا سودا ہو رہا ہے۔ خیر سنیے۔ کئی برس پہلے کی بات ہے یعنی تقریباً ۲۵-۲۶ سال پہلے جب خان نواز اس کاشانے کا مالک تھا اور اس کی دوسری بیوی سے ایک بہت خوبصورت لڑکی اس کی اکیلی اولاد تھی۔ جسے لوگ قاچار کی حور کہتے تھے۔ ایک دن شہر سے

ایک اجنبی یہاں موسم سرما گزارنے کے لیے آیا۔وہ بہت شریف باوقار اور سخی نوجوان تھا۔مگر وہ اتنا تنہائی پسند اور شرمیلا تھا کہ وہ دن گھر کا شانے سے باہر نہ نکلتا اور نکلتا بھی تو جھٹپٹے کے بعد۔ اور یہ راز تو بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل اس کی وجہ خان نواز کی بیٹی شاہینہ تھی۔وہ اسے دل دے بیٹھا تھا اور شاہینہ نے بھی قاچار کے بہتر سے بہتر نوجوان پر اس کو ترجیح دی۔شاہینہ باپ کے ساتھ کاشانے میں ہی رہتی تھی۔اور اسی وجہ سے وہ بھی سارا سارا دن کاشانے میں ہی گزارتا۔ ان کی محبت کا یہ راز سب سے پہلے خان نواز کے ایک وفادار نوکر کو معلوم ہوا۔لیکن وہ جانتا تھا کہ خان کے کانوں تک اگر اس کی بھنک بھی پہنچ گئی تو وہ جلاد صفت انسان ان دونوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ ڈالے گا۔اس نے جہاں تک ممکن ہوسکا ان دو محبت کرنے والوں کی حفاظت کرنے کی کوشش کی۔کبھی ایسا بھی ہوا کہ اسی پچھلے چھجے میں کھڑے وہ دونوں باتیں کرتے ہوتے اور اوپر آتے ہوئے خان کو اس کے نوکر نے دوسری باتوں میں لگا کر وہیں سے لوٹا دیا۔ مگر کہاں تک۔خان اول تو محبت جیسے لفظ کو ہی گالی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔دوسرے یہ بات تو وہ کبھی برداشت نہ کرتا کہ اس کی لڑکی ایک غیر قاچاری کو پسند کرے۔آخر ایک دن خان نواز کو یہ معلوم ہی ہوگیا کہ روز شام کے جھٹپٹے کے بعد شہری مہمان کہاں جاتا ہے۔کیوں کہ اس سے پہلے ہی شاہینہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ پل کی طرف گھومنے نکل جایا کرتی تھی اور کبھی کبھی تو کئی گھنٹوں کے بعد اکیلی واپس لوٹتی۔اگر خان نواز کو شاہینہ کی سہیلی کسی رشک یا حسد کے جذبے کے تحت خود نہ بتاتی کہ شاہینہ تو صرف اسے اس کے گھر تک چھوڑ کر ہی واپس آجاتی ہے تو شاید وہ اپنی بیٹی پر کبھی شک نہ کرتا۔اور اس کے دوسرے دن جب پہلے شاہینہ اور اس کے بعد شہری مہمان کاشانے سے جا چکے تھے۔خان نواز غصے میں سرخ چہرہ اور چنگاری برساتی ہوئی آنکھیں لے کر اٹھا۔اس نے بھیڑیوں کا شکار کرنے والی اپنی کلہاڑی کاندھے پر رکھی اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر چلا گیا۔اس کے بہت دیر بعد وہ رات کی تاریکی میں استرا خان کی پہاڑی سے اتر کر واپس آیا۔اس کی آنکھوں سے اب بھی چنگاریاں برس رہی تھیں۔اور شاہینہ کا لبادہ اس کے

ہاتھ میں تھا، جو خون سے لت پت ہو رہا تھا۔اس نے آ کر بتایا کہ شاہینہ کو استرا خان کے خونی بھیڑیے کھا گئے۔اس بے ماں کی بچی کے لیے جب باپ نہ رویا تو رونے والا اور کون تھا۔ سوائے اس نوکر کے جو یہ جانتا تھا کہ خان جھوٹ بول رہا ہے۔جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ نیلے آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں جب نیچے سے بہتی ہوئی لاجورد کے کنارے استرا خان کے ایک اونچے ٹیلے پر شاہینہ اپنے محبوب کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔خان نواز کی گرج نے انھیں اچانک شیر کے سامنے پڑ جانے والے بکری کے بچوں کی طرح لرزا دیا تھا۔شاہینہ خود اپنے محبوب اور باپ کے درمیان آ گئی۔مگر اس سے پہلے کہ بے رحم خان کی کلہاڑی شاہینہ کے سر دو ٹکڑے کر دے،اس کا پردیسی محبوب اسے بچانے کے لیے اس کے باپ پر جھپٹ پڑا۔وہ بھی قد آور اور تندرست آدمی تھا۔لیکن اب اتنا بھی نہیں کہ خان نواز سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا۔وہ لڑتے ہوئے ٹیلے کے کنارے تک آ گئے۔اور شاہینہ کی فریاد کرتی ہوئی چیخیں بوڑھے پہاڑ استرخان کی فضا میں اِدھر سے اُدھر تک بھٹکتی رہیں۔بالآخر خان کا ہاتھ چھوٹ گیا اور اس کی کلہاڑی پردیسی مہمان کی پیشانی پر پڑی۔وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا اور پھر نیچے گہرائی میں پھسلتا چلا گیا۔یہاں تک کہ لاجورد کے گہرے پانی میں اس کے گرنے کی آواز نے ایک برف سے ڈھکی جھاڑی میں چھپ کر یہ تماشا دیکھنے والے نوکر کو چونکا دیا۔مگر اب تو تو خان اور بھی خونخوار ہو چکا تھا۔اس کی کلہاڑی پھر بلند ہوئی اور پھر ایک دردناک چیخ نے استرا خان کے بھیانک سناٹے کو لرزا دیا۔خان نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور انھیں بھی اوپر سے لاجورد کے گہرے پانی میں پھینک دیا۔پھر وہ اس کا خون میں لتھڑا ہوا لبادہ اٹھا کر پلٹا ہی تھا کہ خوفزدہ نوکر بھاگ کھڑا ہوا۔خان نے دیکھ لیا اور وہ اس راز کو جاننے والے کو بھی ختم کر دینے کے لیے بے تحاشا اس کے پیچھے دوڑا۔کچھ خوف اور کچھ اپنی کمزوری سے خان کا نوکر زیادہ تیز نہ دوڑ سکا۔اس کے پیروں میں سپاٹ جوتے بھی نہ تھے کہ وہ برف پر پھسلنے ہی لگتا۔خان نے اسے دبوچ لیا۔مگر جب نوکر نے بہت منت سماجت کی اور

خدا کا واسطہ دیا تھو خان نے اس پر رحم کھاتے ہوئے چھپ کر سارا حال دیکھنے کی پاداش میں اس کی آنکھیں نکال لیں۔ اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس کا یہ راز راز نہ رہا تو نوکر کا بھی وہی حشر ہوگا جو شاہینہ کا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اندھے قوزی نے ایک جھرجھری لی اور انگیٹھی کے طرف ہاتھ پھیلا دیے۔

''پھر کیا ہوا اس نوکر کا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ قوزی۔'' خان خلیل نے جواب دیا۔ اور وہ سب حیرت سے چھل پڑے۔

''تو کیا یہ بالکل سچا واقعہ ہے؟'' ادھیڑ عمر عورت نے مری ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

''ہم قاچاری جھوٹ نہیں بولا کرتے۔'' خان خلیل کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔

''تو وہ آدمی کیوں ہوا۔ اسے تو راکھشس کہنا چاہیے۔'' ڈاکٹر کا ساتھی بھی بولے بغیر نہ رہا۔

''اور تب سے...'' قوزی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''تب سے کیا؟'' زلفی اس کرید نے لگی۔

''تب سے نہ جانے کیوں جب سال کے وہی دن آتے ہیں اور برف گرنی شروع ہوتی ہے تو دور استرا خان سے ایک عجیب سی آواز، صدائے بازگشت کی طرح راتوں کے اندھیرے میں سنائی دیتی ہے۔ جیسے کوئی کسی کو پکار رہا ہو۔ اور...''

''اور کیا؟'' ڈاکٹر کے بھانجے نے پراشتیاق اور کسی قدر دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اور وہ چیخیں، بالکل ویسی ہی جیسی میں نے اس رات شاہینہ کے حلق سے نکلتی سنی تھیں جب خان نے اس پر کلہاڑی چلائی تھی۔''

''اوہ خدا، یہ تو بڑی بھیانک بات ہے۔'' ادھیڑ عمر عورت بولی۔

Akram Allahabadi

''شاید اس بے چاری کی روح بھٹکتی پھرتی ہوگی۔''ڈاکٹر نے کہا اور اس جملے پر وہ سب جھری جھری لے کر چونک پڑے۔

''روح؟''ڈاکٹر کے بھانجے نے مرے ہوئے سے لہجے میں دوہرایا۔

''لیکن ہمنے تو کوئی چیخیں نہیں سنیں، ڈیڈی۔ہمیں تو یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔''

''وہ چیخیں پچھلے چار دنوں سے برابر سنائی دے رہی ہیں، دور، مدھم۔لیکن آپ لوگ جلد اپنے بستروں میں چلے جاتے ہیں وہ چیخیں آدھی رات کے قریب سنائی دیتی ہیں۔''خان خلیل نے بتایا۔اس تذکرے سے وہ سب جیسے آسیب زدہ سے ہو گئے تھے۔ان کے چہروں پر خوف اور تذبذب کے ملے جلے آثار تھے۔

''یہاں اور کسی نے ان کا ہم سے ذکر بھی نہیں کیا۔''ڈاکٹر کے ساتھی نے کہا۔

''اوہ۔اب یہ ہم لوگوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں رہ گئی ہے۔ہم کئی سالوں سے اس موسم میں ان چیخوں کے سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔ویسے یہ تو قوزی کا خیال ہے کہ وہ شاہینہ کی چیخ جیسی آوازیں ہی ہوتی ہیں۔ورنہ عام طور پر لوگوں کو ان چیخوں پر اس بگلی کے گمان ہوتا ہے جو وادی کے سرے پر جھونپڑے میں رہتی ہے۔وہ اکثر دن میں بھی چیختی پھرتی ہے۔''خان خلیل نے بتایا۔

''ہم بھی کہاں وہموں جیسی حماقتوں میں مبتلا ہو گئے۔''ڈاکٹر نے سر کو جھٹک کر کہا۔

''گیارہ بج رہے ہیں۔اگر یقین نہ ہو تو ایک گھنٹہ انتظار کر کے دیکھ لیجیے۔''قوزی نے اپنی ڈفلی سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''ڈیڈی، ہم آج انتظار کریں گے۔''زلفی بول اٹھی۔

''دماغ خراب ہوا ہے لڑکی تمہارا۔''ادھیڑ عمر عورت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

Akram Allahabadi

''آخر حرج بھی کہا ہے۔ایک دن دیر سے ہی سو لینگے۔'' ڈاکٹر نے گویا زلفی کی تائید کی۔پھر انھوں نے قوزی کو کچھ سکے انعام میں دے کر رخصت کر دیا۔اور خان خلیل بھی ان سے رخصت طلب کر کے شب بخیر کہتا ہوا چلا گیا۔وہ اس نئی داستان میں کھو کر موسم بہار کے مہمان کو اب بھول چکے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

اس موسم میں اور خصوصاً جب کہ وادیٔ قاچار ایسے سرد مقام پر موسم گرما گزارنے کا خبط سمایا ہو۔ڈاکٹر کے لیے بغیر برانڈی کے گزر ہی ناممکن تھا۔اور باقی لوگ صرف گرم کافی پر اکتفا کر رہے تھے۔شہر میں ایسے موسم اور ایسے لمحات کہاں نصیب ہوتے ہیں۔وہ اپنے گرم لبادوں میں لپٹے، پیروں پر شال یا کمبل ڈالے، انگیٹھیوں کو گھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔تیز کی طرح بدن کے عریاں حصوں پر لگنے والی ہوا کی روک کے لیے برآمدے کے پچھلے حصے پر فینسنگ کے اوپر ڈوری دار پردہ گرا لیا گیا تھا۔اور ویسے بھی وہ اس تفریح کے ایام سے زیادہ سے زیادہ لطف لینے کے خیال سے اپنی شہری مصروفیات سے قطعی خالی الذہن ہو کر یہاں کی معمولی سے معمولی باتوں سے دلچسپی لیتے تھے۔دوپہر میں ایک نیند سو لینے والے عموماً راتوں کو دیر سے ہی سویا کرتے ہیں۔اس لیے اس وقت نیند کسی کی آنکھوں میں نہ تھی۔تقریباً گیارہ بجے خلاف معمول ان کے لیے روما خود تازہ کافی تیار کر کے لائی۔حالاں کہ یہ خدمت یا تو نوکروں کے سپرد تھی یا خود خلیل خان آیا کرتا تھا۔روما کی آمد غیر متوقع تھی۔

''یہ آج چاند کدھر سے نکل آیا؟'' ادھیڑ عمر کی عورت بولی۔''ہم تو سمجھتے تھے کہ تم ہم لوگوں سے دور ہی بھاگتی ہو۔'' اس نے کہا۔اور ڈاکٹر کا ساتھی اس طرح سر ہلانے لگا جیسے اس کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔

''جی۔ایسی کوئی بات نہیں۔پاپا کے سر میں ذرا درد ہے۔اس لیے میں ہی لے

آئی ۔ہم لوگ نوکروں کو اس وقت چھٹی دے دیا کرتے ہیں ۔"

"خیر، خیر، یوں ہی سہی ۔مگر تمہارا نام کیا ہے، بیٹی؟" ڈاکٹر نے مشفقانہ انداز میں سر ہلا کر پوچھا۔

"روما۔" وہ شرمیلے انداز میں سر جھکا کر بولی ۔

"کتنا رومانٹک نام ہے ۔" ڈاکٹر کے ساتھی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔

"جی ؟" روما چونکی ۔وہ شاید انگریزی کے الفاظ تو سمجھتی بھی نہ تھی ۔

"کچھ نہیں ۔کچھ نہیں ۔ان کا مطلب ہے کہ بہت اچھا نام ہے ۔" ڈاکٹر نے اپنے ساتھ کر مذمت کرتی ہوئی نظروں سے گھورنے کے بعد اس کی طرف پلٹ کر جواب دیا ۔لیکن روما اس کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اجنبی مہمان کے کمرے کے بند دروازے کی طرف حسرت سے دیکھ رہی تھی ۔

"کیا یہ صاحب کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتے ؟" ڈاکٹر نے روما کو ٹوک کر پوچھا۔

"جی ؟ اوہاں ۔نکلتے کیوں نہیں ۔مگر بہت کم ۔" روما نے جواب دیا۔

"تکان کی وجہ سے سو گئے ہوں گے ۔سفر سے آئے ہیں نا ۔" ڈاکٹر کا بھانجہ بولا ۔

"اچھا ایک بات بتاؤ ۔" ادھیڑ عمر کی عورت نے اس کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا ۔"کیا واقعی آدھی رات کو ادھر سے کسی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں؟"

"جی ہاں ۔کبھی کبھی میں نے بھی سنی ہیں ۔" روما نے جواب میں کہا اور پھر خالی ٹرے لے کر اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر اپنے ساتھ پر بگڑ گیا ۔

"تم نے تہذیب سے گری ہوئی حرکت تھی ،نصرت ۔یہ شہر کا ماحول نہیں ہے، جہاں ترقی پسند لڑکیاں اس قسم کے جملوں پر خوش ہوتی ہیں ۔"

"میں نے کسی غلط خیال سے ..." نصرت نے کہنا چاہا۔

"رہنے دو ۔میں جانتا ہوں تمہارے منہ میں لگام نہیں ہے ۔لیکن یہ قاچاری بڑے

کٹر مشرقی لوگ ہوتے ہیں۔"

"میں احتیاط رکھوں گا۔" نصرت نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ ڈاکٹر کا بھانجہ اس وقت بھی انگیٹھی کے انگاروں کو لوہے کی سلاخ سے الٹنے پلٹنے کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اور زلفی دستانے اتار کر دونوں ہاتھ انگیٹھی کی آنچ پر سینک رہی تھی۔

"کیا یہ خبط نہیں ہے کہ ہم یوں ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیوں نہ کارڈز کھیلے جائیں۔" نصرت کچھ سوچ کر بولا۔

"اوہ، میں بھی یہی کہنے والی تھی، ڈیڈی۔" زلفی نے تائید کی۔

"اور میں بھی۔" ڈاکٹر کا بھانجہ زلفی کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آخر ہو نا چڑی کے غلام۔" نصرت نے اس کے بازو میں چٹکی بھر کر آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے ناخوش گوار سے لہجے میں پوچھا۔

"لڑکیوں کی اس طرح ہاں میں ہاں ملانے سے ان کے دماغ چوتھے آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔" نصرت نے سرگوشی کے لہجے میں بتایا۔

"میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ زلفی کا موڈ کچھ مغرورانہ ہو رہا ہے۔" وہ اسی سے زلفی کی شکایت کرنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے کہ عقل سلیم گھاس نہیں چر گئی تمہاری۔"

"ہُم۔" ڈاکٹر کا بھانجہ زیر لب یہ کہہ کر پھر زلفی کو گھورنے لگا۔ زلفی کی نگاہیں آگ پر جمی ہوئی تھیں۔

بہر حال وہ بڑی تپائی درمیان میں ڈال کر تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ انگیٹھیاں تپائی کے دائیں بائیں رکھ دی گئیں۔ اور ڈاکٹر نے انھیں سختی سے ہدایت کر دی کہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہنے کی بجائے کھیل خموشی سے کھیلا جائے۔ پھر ڈاکٹر کی کلائی کی گھڑی بارہ بجانے لگی

اوران میں سے ادھیڑ عمر عورت کو ہی سب سے پہلے نیند آنے لگی۔وہ ان کے کھیل سے الگ ہوکر اپنی کرسی پر ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

اس وقت بر باری کچھ کم ہوگئی تھی۔البتہ ہوا تیز چل رہی تھی اور دور شاید استرا خان کی بلندیوں سے ہی گیدڑوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

''بھئی خوب جمی ہے بازی۔مزہ آرہا ہے۔''نصرت نے کھیل سے لطف لیتے ہوئے کہا۔

''شش...''اچانک ڈاکٹر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ڈاکٹر کی اس حرکت سے دوسروں کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔اور زلفی کا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''کیا بات ہے؟''ڈاکٹر کے ساتھی نے آہستہ سے پوچھا۔

''چیخ۔مجھے کوئی چیخ سنائی دی تھی۔''ڈاکٹر نے بتایا۔

''لاحول ولاقوۃ۔وہم ہوگا آپ کا۔''وہ اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرنے لگا۔مگر ڈاکٹر کوئی جواب دینے کی بجائے اسی طرف اپنے کان لگائے رہا۔اور ہو لوگ پھر اپنے کھیل میں لگ گئے۔لیکن دوسرے ہی لمحے انھیں اپنی نشستوں سے اچھل پڑنا پڑا۔واقعی ایک تیز چیخ کی آواز یخ بستہ ہوا کے پردے کو چیرتی ہوئی کیمپ نشیب کی طرف سے سنائی دی تھی۔پھر ایک بار ان کے کانگھڑے ہوگئے اور وہ حیرت زدہ سے اس سمت رخ کر کے بیٹھ گئے جدھر کاشانے کے عقب میں استرا خان کا ڈھلوان،ویران اور تاریک پڑا تھا۔ہوا کا شور زیادہ نہ تھا۔لیکن ابھی تک دور برفستانی اونچائیوں سے سیاروں کی آوازیں آرہی تھیں۔اور پوری وادی قاچار سکون کی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔انھیں خود کو ایسے عالم میں جاگے محسوس کر کے ایک نامعلوم اور عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔

''وہ....وہ...سنو....''ادھیڑ عمر کی عورت جو نیند سے چونک کر خود بھی سراپا حیرت بنی

بیٹھی تھی، خوف زدہ لہجے میں بولی۔اور وہ اپنی قوت سامعہ سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرنے لگے۔واقعی، وہ ایک عجیب سی آواز تھی۔جو رونگٹے کھڑے کردینے والی اس برفیلی رات کے بھیانک سناٹے کوتوڑتی ہوئی انھیں سنائی دے رہی تھی۔ایک صدائے بازگشت جوکبھی استرا خان کے ایک سرے پر سنائی دیتی اور کبھی دوسرے سرے پر اور کبھی ڈھلوان کے پاس۔جیسے کوئی کسی کا پکار رہا ہو۔

"آ...جا...او..."

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" ادھیڑ عمر عورت نے کہا۔اور زلفی کا چہرہ تو پہلے ہی فق ہو چکا تھا۔اندھے قوزی کے بیان کردہ واقعہ سے اس نے جتنی دلچسپی لی تھی اس سے زیادہ دہشت اس پر اسوقت سوار ہوگئی تھی۔کیا واقعی وہ کوئی سچی کہانی تھی؟ اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔کیا وہ اس لڑکی کی روح ہوگی؟ ایک ایسی روح جو کئی سالوں سے استرا خان کے ویران پہاڑ پر بھٹکتی پھر رہی ہے۔مگر نہیں۔یہ اس پاگل عورت کی بھی تو آواز ہوسکتی ہے، جس کا ذکر قوزی نے کیا تھا۔وہی ہوگی۔یہ سوچتے ہوئے زلفی نے سر کو اس جھٹکا جیسے ذہن کو اس آسیبی دہشت سے خالی کرنے کی کوشش کر رہی ہو جو ابھی ابھی ان انجانی چیخوں کے ساتھ اس پر مسلط ہوگئی تھی۔

اور اس بار ڈاکٹر سے رہا نہ گیا۔وہ تپائی کے کونے پر رکھی ہوئی ٹارچ ہاتھ میں لے کر اٹھا۔

اب کی بار وہ چیخ ڈھلوان سے ہی سنائی دی تھی۔زلفی کا کلیجہ پھر ہل گیا۔اور ادھیڑ عمر کی عورت تو اپنی جگہ کانپ کر رہ گئی۔باہر برفیلی ہوا نے اب شائیں شائیں کا شور بھی پھیلانا شروع کردیا تھا۔اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے نے طرح طرح کے بھیانک سائے اگلنا شروع کردیے تھے۔اس کا دل لرزنے لگا۔حالاں کہ وہ کافی تندرست عورت تھی۔

اس کے ساتھ ہی انھیں کسی دروازے کے پٹوں کے بار بار زور سے بند ہونے اور کھلنے کی آواز نے چونکا دیا۔اجنبی مہمان کے کمرے کی کھڑکی کے کھلے پٹ زور زور سے ہل

رہے تھے۔

''بیوقوف آدمی، اس موسم میں رات کو کھڑکی کھلی رکھ کر سو رہا ہے۔'' ڈاکٹر بڑبڑایا۔

''ڈاکٹر، وہ چیخ۔'' اس کا ساتھی تقریباً چیخ اٹھا۔ انھیں ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اب کی بار یہ چیخ کاشنے کے عقب میں ہی کہیں قریب سے سنائی دی تھی۔ اور ڈاکٹر نے جیسے ہی عقبی فینسنگ پر گرا ہوا پردہ ہٹا کر اپنی ٹارچ کی روشنی نیچے سامنے کی طرف ڈالی۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور زلفی کی چیخ نکل گئی۔

وہ نیچے برفیلے ڈھلوان پر کھڑی تھی۔ برف کی طرح ہی سفید ٹارچ کی روشنی میں ڈاکٹر نے اس کا پورا خاکہ دیکھا تھا۔ اسے خاکہ ہی کہنا چاہیے۔ کیوں کہ جس چیز کو دیکھ کر ڈاکٹر خوف زدہ ہو گیا تھا وہ یہ کہ ٹارچ کی روشنی اس کے جسم پر پڑنے کے باوجود برف کی سطح پر اپنا مکمل دائرہ بنا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کا خوبصورت چہرہ بھی۔ ڈاکٹر کے ساتھی کی ٹارچ کی روشنی بھی اسی پر پڑی تھی۔ اور وہ سکتے کے عالم میں رہ گیا تھا۔ وہ گہبت خوبصورت چہرہ تھا جو اس کی نظر پڑا تھا۔ لیکن جس انداز سے اس کے کھلے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، انھوں نے اسے بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔

''وہ... وہ... وہی تھی، ڈیڈی۔'' زلفی نے گھگھیاتی ہوئی آواز میں کہا۔

ان سب نے ہی اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکے۔ ٹارچوں کی روشنیاں برف پر دائرے بناتی رہیں۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ اور دور جہاں تک پانچ سیلس (cells) کی ایک ٹارچ اپنی روشنی پھینک سکتی تھی، انھیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔

وہ کچھ دیر تک وہیں حیرت و خوف سے بت بنے کھڑے رہے۔ پھر ڈاکٹر نے ہی اس سکوت کو توڑا۔

''میں کبھی نہ مانتا، مگر... مگر آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا پلٹا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اپنے کمروں میں چلیے۔" ادھیڑ عمر کی عورت، ڈاکٹر کا بازو تھام کر بولی۔

"ہاں ہاں، چلو چلو۔" ڈاکٹر خود بھی گھبرائے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ابھی تک وہ سجے ایک کہانی یا ایک وہم سمجھ کر محض تفریح کے لیے دلچسپی لے رہے تھے، او ے اپنی آنکھوں سے ایک واقعہ کی طرح دیکھ کر وہ ذہنی طور پر چکرا گئے تھے۔ کوئی منہ سے کچھ نہ بولا۔ صرف ان کے ذہن الجھے رہے اور وہ دبک کر سرد ہوتی ہوءا نگیٹھیاں وہیں چھوڑ کر اپنے کمروں کی طرف جانے لگے۔ سرے کا اجنبی مہمان والا کمرہ چھوڑ کر دوسرے اور تیسرے کمروں پر ان لوگوں کا قبضہ تھا۔ ایک میں ڈاکٹر، زلفی اور ادھیڑ عمر کی عورت کا قیام تھا۔ اور دوسرے میں ڈاکٹر کے ساتھی اور اس کے بھانجے کا۔ ان دونوں نے تو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ مگر ٹھیک اس وقت جب زلفی اپنے روم کا دروازہ اندر سے بند کرنے جارہی تھی، کسی کھٹکے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ہمت کر کے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا اور جو کچھ اس نے دیکھا وہ اس کی سمجھ سے بعید تھا۔ وہ آواز اس اجنبی مہمان کے کمرے کا دروازہ کھلنے یا شاید بند ہونے کی تھی اور وہ شہر خموشاں جیسی اس پر کوت رات کے بھیانک سناٹے میں اپنا وہی لبادہ پہنے، کمرے سے نکل کر زینے کی طرف جارہا تھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور... مگر جب وہ ان موم شمعوں کے قریب سے گزرنے لگا، جو وہ گھبراہٹ میں جلتی چھوڑ آئے تھے تو نہ جانے کیوں یا شاید ہوا کے کسی تیز جھونکے سے وہ اچانک بجھ گئیں۔ اور برآمدے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ زلفی نے گھبرا کر دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے اندر سے زنجیر چڑھا دی۔

"کیا بات ہے، بیٹی؟" ڈاکٹر نے اس کو گھبرائے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"ڈیڈی، اس نئے مہمان کا دماغ تو خراب نہیں ہے کہیں؟ وہ ابھی اس خوف ناک رات میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر گیا ہے۔" زلفی نے بتایا۔

"جوان مرد معلوم ہوتا ہے۔ بوڑھا نہ ہوگیا ہوتا، تو شاید میں بھی اس چیخ کا راز

جاننے کے لیے باہر جائے بغیر نہ رہتا۔''بوڑھے ڈاکٹر نے آتش دان کے قریب کھڑے ہو کر اپنا سگار سلگاتے ہوئے کہا۔

''بڑی بھیانک رات ہے آج۔''ادھیڑ عمر عورت، جو اب موٹے گدوں والے اپنے گرم بستر میں گھس چکی تھی، بولی۔

''کیوں نہیں۔کل تک یہی راتیں بڑی خوش گوار معلوم ہوا کرتی تھیں تمہیں۔مگر آج وہ چیخیں سن لی ہیں نا۔''ڈاکٹر نے اس پر طنز کیا۔

''ڈیڈی، کیا واقعی روحیں بھٹکتی بھی پھرتی ہیں؟''زلفی نے کچھ سوچتے ہوئے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

''سنا ہے تو ہے کہ جن کی موتیں بعض خاص حالات میں واقع ہوتی ہیں...۔''ڈاکٹر نے کہنا چاہا۔مگر ادھیڑ عمر عورت نے، جو ڈاکٹر کی بیوی ہی ہو سکتی تھی، ڈرے ہوئے لہجے میں چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔

''خدا کے لیے اب سو جایئے۔یہ کیا تذکرہ لے بیٹھے آپ؟''وہ بولی۔

''اچھا اچھا۔مگر نیند کی ضرورت پہلے تمہیں ہے۔تم ڈری ہوئی ہو نا۔''ڈاکٹر نے اس کا مذاق اڑایا۔

''کون؟ میں؟ نہیں تو۔لیکن کیا آرام کا وقت نہیں ہو گیا ہے؟''ڈاکٹر کی مسز نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا۔

''ڈیڈی، میں تو سو گئی۔''زلفی نے آنکھیں بند کر کے اعلان کیا۔

''لو ہم بھی سو گئے، لو۔''یہ کہہ کر ڈاکٹر بھی اپنے بیڈ میں گھس گیا۔لیکن دانستہ یا شاید بھول سے ہی کمرے کی روشنی کسی نے بھی گل نہیں کی۔ممکن ہے اندر وے وہ تینوں ہی آج کے عجیب واقعے پر کچھ خوف محسوس کر رہے ہوں اور اندھیرا اس قسم کے تصورات کو اور ہول ناک بنا دیا کرتا ہے۔ان کے دلوں کے چور کی پہچان یہ تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی اس وقت کسی

سے یہ نہیں کہا کہ وہ سونے سے پہلے شمع گل کر دے۔اور بستر کے اندر بھی ان کے کان، کہیں دور، استرا خان کے کسی حصے سے آتی ہوئی وہی صدائے بازگشت سن رہے تھے۔ جیسے کوئی اندھیرے می اوٹ سے کسی کو بلا رہا ہو۔ ''آ...جا...او....''

☆☆☆☆☆☆

صبح ناشتے کی میز پر بھی انکے دماغ بوجھل بوجھل سے ہو رہے تھے۔رات کا واقعہ انھیں جیسے ایک بھیانک خواب کی طرح یاد آ رہا تھا۔لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس واقعہ کو کوئی خوف یا اثر ابھی تک اس کے ذہن پر مسلط ہے اور اس جون مردی کے اظہار کے لیے وہ اس تصنع سے کام لے رہے تھے جیسے انھیں کچھ یاد ہی نہ ہو کہ رات کوئی ان ہونی سی بات بھی ہوئی تھی۔البتہ زلفی کی نگاہیں نہ جانے کیوں ہر بار اس اجنبی مہمان کے بند دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔رات وہ اسے ٹھیک سے نہ دیکھ سکی تھی۔لیکن اس وقت دن میں وہ اس آدمی کی صورت دیکھنا چاہتی تھی، جس کے لیے اس نے سنا تھا کہ قاچار کی حسین دوشیزائیں اس اپنے ہم قوم نوجوانوں پر ترجیح دیتی ہیں۔ڈاکٹر کا بھانجہ غور سے زلفی کی شکل دیکھ رہا تھا۔شاید وہ اس کے موڈ کا اندازہ لگانے کی کوشش میں تھا یا ممکن ہے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے حسین پیکر کو جذب کر لینا چاہتا ہو۔وہ اس وقت سرخ فراک، سفید غرارے اور سفید سیفون کے دوپٹے میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔

''زلفی، تم کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہو؟'' وہ بالآخر پوچھ ہی بیٹھا۔

''کون؟ یہ کس نے کہا تم سے؟'' زلفی چونک کر بولی۔

''میرے دل نے۔'' وہ آہستہ سے سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

''کیا تمہاری شکل دیکھ کر اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا؟''

''اوہ۔تو اب آپ قیافہ شناس بھی ہو گئے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔''اچھا بتایئے اس وقت آپ کی شکل کیا کہہ رہی ہے؟'' زلفی نے پر مذاق لہجے میں کہا۔

''میں بتاؤں؟'' زلفی نے خود ہی پوچھا اور جوب میں اس نے بیوقوفوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ کی شکل کہہ رہی ہے کہ آپ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔'' زلفی نے اپنے حنائی ہاتھوں سے چائے کی ایک بھری ہوئی پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔اس جملے پر اس کا منہ کچھ اتر سا گیا اور ڈاکٹر کا ساتھی، جس نے ان کی گفتگو سن لی تھی، مسکرانے لگا۔

''اب تم میرا مذاق اڑانے لگی ہو۔'' ڈاکٹر کا بھانجہ منہ لٹکا کر بولا۔

''نہیں، میں نے تو سچ کہا ہے۔آپ کا دل جانتا ہے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔''

''قطعی صحیح ہے۔'' ڈاکٹر کا ساتھی بول اٹھا۔''بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ شکل سے پورے ملا دوپیازہ نظر آرہے ہیں اس وقت۔'' اس نے کہا۔

''نصرت بھائی۔'' وہ احتجاجاً تیز لہجے میں بولا۔''میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔''

''تو تم میری بے عزتی بھی نہیں کر سکتے۔ویسے کیا یہ اچھی بات ہے کہ اچھے خاصے موڈ کو سوگوار بنایا جائے۔'' نصرت کا لہجہ مشفقانہ ہی تھا۔

''لیکن میں تو ایک بات کہہ رہا تھا۔یہ زلفی نے ہی طنز کیا ہے مجھ پر۔'' وہ جھینپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاہاہا...اور آپ کو میری پریشانی سے ہمدردی نہیں ہوگئی تھی؟'' زلفی نے منہ بنا کر کہا۔

''میں نے ہزار بار کہا ہے، زلفی، کہ تم لوگ کھانے یا ناشتے کی میز پر غیر ضروری باتیں نہ چھیڑا کرو۔'' ڈاکٹر نے ان دونوں کو ڈانٹا۔اور وہ ایک دوسرے کو گھور کر خاموش ہو گئے۔ لیکن اسی وقت خان خلیل بھی آ پہنچا۔وہ شاید مہمانوں کی مزاج پرسی کرنے آیا تھا۔

''کاشانے کے معزز مہمانوں کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' اس نے سلام کرنے والے انداز میں ذرا سا جھک کر ان سے پوچھا۔

''اوہ نہیں۔ہمیں یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔'' ڈاکٹر بول پڑا۔

Akram Allahabadi

''سنو، بھائی خلیل خان۔'' ڈاکٹر کے ساتھی نے اسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ ''رات کو ہم نے وہ چیخیں سنی تھیں۔''

''جی ہاں، ضرور سنی ہوں گی۔'' خلیل نے اس طرح جواب دیا جیسے کوئی غیر اہم سی بات اس سے کہی گئی ہو۔ اور ڈاکٹر کے ساتھی نے اس جواب پر خاموش ہی رہ جانا مناسب سمجھا۔

''ہماری رات کافی پریشانی میں گزری ہے۔ کیوں نہ ان کمروں کو چھوڑ کر دوسرے لے لیے جائیں۔؟ ڈاکٹر کی مسز نے خلیل اور ڈاکٹر کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔

''نہیں ڈیئر۔ یہ بڑی بزدلانہ بات ہوگی اور وہ چیخیں ہمارا بگاڑتی بھی کیا ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جی ہاں، مادام۔ اور ہوٹل میں اس وقت کوئی ایک بھی کمرہ خالی نہیں ہے۔ بلکہ یہیں کیا اب تو یہاں کے کسی ہوٹل میں بھی جگہ ملنا ناممکن نہیں۔'' خلیل نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، بھئی۔ ہم یہیں رہیں گے۔ ان ہی کمروں میں۔ آخر یہ ڈر کونسی حماقت ہے؟'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اپنی مسز کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

خلیل یہاں سے کھسکنا چاہتا تھا کہ زلفی نے اسے روک لیا۔ ''ایک بات تو بتاؤ۔ یہ تمہارے موسم بہار کے مہمان صاحب کچھ خبطی ہیں کیا؟''

''آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، مادام۔ وہ بڑے کم گو شریف اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔'' خلیل ان اسے بتایا۔

''لیکن کل آدھی رات کو وہ کمرے سے نکل کر کہاں گئے تھے۔ میں نے خود انھیں نیچے جاتے دیکھا ہے۔''

''نہیں تو۔ نیچے تو میں خود ہال میں ہی لیٹا تھا۔ اور پھر رات کے وقت کاشانے کا دروازہ اندر سے مقفل کرلیا جاتا ہے۔ میں زکام کی وجہ سے خود رات کو ڈیڑھ، دو بجے سو سکا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اوپر سے کوئی نہیں اترا نہ کوہ رات میں ہوٹل بند ہونے کے

بعد باہر جا سکتا ہے۔''خلیل نے سادگی سے بتایا۔

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے زینے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔''زلفی نے خلیل کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''ہو سکتا ہے ڈبلیوسی وغیرہ گیا ہو وہ شریف آدمی۔آخر تم اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔''ڈاکٹر نے زلفی کو جھاڑا۔اور زلفی سوچنے لگی۔ممکن ہے ایسا ہی ہو۔اور پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا کہ زبردستی وہ اس آدمی میں دلچسپی لے رہی ہے۔اس اجنبی سے متعلق اس نے خود ہی جو غیر معمولی تصوارت ذہن میں پیدا کر لیے تھے، وہ اسے مدھم ہوتے معلوم ہوئے اور اسے وہ عام لوگوں کی طرح ایک معمولی آدمی ہی نظر آنے لگا جو ڈبلیوسی بھی جا سکتا ہو۔اس وقت ۹ بج رہے تھے۔وہ ناشتے کی میز سے اٹھ ہی رہی تھی کہ اس نے دروازے کے سامنے سے روما کو گزرتے دیکھا۔وادیٔ قاچار کی یہ معصوم دوشیزہ اس وقت اپنے معمولی لباس میں بھی کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔وہ ہاتھوں پر ایک ٹرے لیے ہوئے تھی۔شاید اس میں موسم بہار کے مہمان کا ناشتہ ہوگا۔نہ جانے کیوں اس وقت اسے اس لڑکی پر رشک ہونے لگا۔

روما اجنبی مہمان کے کمرے کا دروازہ ٹھوک رہی تھی۔لیکن کوئی جواب نہ ملنے پر جب اس نے اس کے ٹ اندر کی طرف دھکیلے تو وہ کھل گیا۔اس کا دل دھک سے رہ گیا۔اس وقت پھر وہ اس کے سامنے جا رہی تھی۔

اس کے خوابوں کی دنیا کا حسین شہزادہ جو سال میں کئی مہینے اسے تڑپان کے بعد اس کے سامنے آیا کرتا تھا۔اس وقت جب انتظار کے ضد بات اتنی شدت اختیار کر جاتے کہ اس کا دل اس کے آجانے کی دعائیں مانگنے لگتا۔لیکن وہ سو رہا تھا۔اس کا خوب صورت چہرہ بڑے بالوں والے بلینکٹ سے باہر تھا۔روما تپائی پر ٹرے رکھ کر اسے جگانے کے بجائے مبہوت وی کھڑی اس کی شکل دیکھتی رہی۔اس کی جرأت نہ ہوئی کہ اسے جگائے۔مگر کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا۔اس خیال سے وہ باہر نکل آئی۔اور اسے دیکھنے والا موجود تھا۔وہ نصرت تھا۔روما نے

ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر زینے کی طرف جانے لگی۔

''کاش کوئی ہم سے بھی اس قدر دلچسپی لیتا۔ہم تو اس کے لیے قربان ہو جاتے۔''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر دبی زبان سے بولا۔خدا نے رومان سنایا نہیں۔لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔وہ زینے کی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ نیچے خان نواز اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''بیٹی،شانو ابھی تک دودھ نہیں لایا ہے۔ذرا تم جا کر دیکھو تو کیا ہو گیا ہے اسے۔وہ مہمانوں کے لیے آئے ہوئے بھیڑوں کے گوشت کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''اور ہاں، اس سے کہہ دینا کلر یادہ دودھ درکار ہا گا۔کل ہم اپنے شہری مہمانوں کو شیر ک کھلائیں گے۔تا کہ کم از کم سال بھر تک ان کی زبانیں اس کی لذت کو یاد کرتے رہیں۔'' وہ خوش گوار موڈ میں کہتا گیا۔

''اچھا بابا۔لیکن ہمارا کل والا مہمان ابھی تک سویا ہوا ہے۔میں ٹرے رکھ کر چلی آئی ہوں۔'' رومانے اسے بتایا۔

''کوئی بات نہیں۔اسے میں دیکھ لوں گا۔تم ذرا جلدی سے یہ کام کر آؤ۔''

رومانے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ نچلے ہی حصے میں ہوٹل کے ایک کمرے میں چلی گئی۔اور دو منٹ کے بعد جب باہر نکلی تو لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ایک گرم شال کا ٹکڑا بھی اس نے سر اور کانوں پر باندھ لیا تھا۔وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔باہر کہر کی وجہ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی صبح ہوئی ہو۔آمد و رفت بھی بہت کم تھی۔اور ان دنوں تو قاچاری کافی دن چڑھے گھروں سے نکلا کرتے تھے۔اسے پل تک جانا تھا۔کیوں کہ پل کے قریب ہی چشمے کے کنارے پر شانو کی جھونپڑی تھی۔رات زیادہ برف گر گئی تھی جس کی وجہ سے جھونپڑی کا دروازہ بھی آدھا برف سے ڈھک گیا تھا۔اور اس وقت شانو کی ادھیڑ عمر بیوی ایک پھاوڑے سے اسے ہٹا رہی تھی۔اندر سے گایوں کے ڈکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔وہ روما کو دیکھتے ہی بول اٹھی۔

''اچھا ہوا تم آ گئیں۔میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ دودھ کیسے جائے گا۔''

''کیوں؟ شانو چچا کہاں ہیں؟''

''ان ہی کی وجہ سے تو۔ وہ کل سے بخار میں پڑے ہیں اور میں انھیں چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی ورنہ میں پہنچا دیتی۔'' وہ بولی۔

''اوہ۔ زیادہ بخار ہے کیا؟''

''ابھی تو ہلکا ہو گیا ہے۔ لیکن رات کو تیز تھا۔ موسم کا اثر معلوم ہوتا ہے۔''

''اچھا لاؤ، دودھ میں لے جاؤں گی۔ شانو چچا جب تک اچھے نہ ہوں، میں یا کوئی نوکر دودھ لے جایا کرے گا۔'' شانو کی بیوی سے روما نے کہا۔

''بڑی اچھی بیٹی ہے۔'' شانو کی بیوی نے اسے بچوں کی طرح چمکارا۔ ''خدا لمبی عمر دے۔''

شانو کے یہاں سے دودھ کا ہنڈا لے کر وہ لوٹی تو پل کے نزدیک ہی اس کا سامنا عطا سے ہو گیا۔ عطا گرانڈیل اور چوڑے کاندھوں والا تیس بتیس سالہ نوجوان تھا۔ بستی کے اوباش نوجوانوں میں اسے لیڈری کا فخر حاصل تھا اور بستی کے تمام امن پسند اور شریف لوگ اسے ناپسند کرتے تھے۔ وہ دلباب کا بیٹا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور کرخت تھا۔ اور اس پر گھنی موٹی مونچھیں اسے اور خوفناک بنائے ہوئے تھیں۔

وہ ہمیشہ روما کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ جس وقت وہ اپنے بالوں دار سپاٹ جوتے پہن کر برف پر چلتی تو عطا کی نظریں اس کے اندازِ خرام پر قربان ہوتی چلتیں۔ وہ تیز اور لہراتی ہوئی چلتی تھی۔ اس اس لبادے پر بھی کبھی کبھی اس کی کمر کی لچک چلتے چلتے نمایاں ہو جاتی۔ عطا کے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث اس کی چال ہی تھی۔ ویسے تو سراپا قیامت تھی وہ۔

آج وہ خلاف معمول اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' روما نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مرتا کیا نہ کرتا۔'' عطا نے دونوں ہاتھ لاپرواہی سے جھٹک کر کہا۔

Akram Allahabadi

''ڈوب مرے ہوتے لاجوردی میں۔''

''ہائے، میں تو تمہاری ان خوب صورت آنکھوں کی شفاف جھیلوں میں ڈوب چکا ہوں۔'' وہ اس کے حسین چہرے کو سحر زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سرد سانس کھینچ کر بولا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں میرا اس طرح راستہ روکتے ہوئے؟''

''شرم تو تمہیں آنی چاہیے جو ہم جیسے قاچاری نوجوانوں کو چھوڑ کر اس پردیسی مہمان پر قربان ہوئی جارہی ہو۔'' عطا نے پہلی بار اس پر طنز کیا۔

''میں بابا سے ابھی شکایت کرتی ہوں تمہاری۔''

''تمہارا بوڑھا بابا مجھے توپ دم نہیں کردے گا۔ آج تو میں فیصلہ کر کے آیا ہوں۔''

''کیسا فیصلہ؟''

''ہم قاچاری جس چیز کو بخوشی حاصل نہیں کر سکتے اسے زبردستی اٹھالے جایا کرتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ اس زور سے روما کے ہنڈے والے ہاتھ پر مارا کہ دودھ کا ہنڈا اس کے ہاتھ سے دور جا گرا۔ روما کی چیخ دور تک سنائی تو دی گئی ہوگی۔ لیکن دور سے کہر کی دھند میں یہ معلوم کر لینا بھی مشکل تھا کہ آواز کس طرف سے آئی ہے۔ یا کون چلا رہا ہے۔

روما کی مدافعت ناکام رہی۔ عطا نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا۔ پل کے دوسری طرف اس کی کتوں کی گاڑی موجود تھی۔ اس نے روما کے منہ پر ریشمی رومال ایک لگام کی طرح ٹھونس کر باندھ دیا اور گاڑی میں پڑی ہوئی ریشمی ڈوری سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے گاڑی میں ڈال دیا۔

کتے باریک سرے والے چابک کی آواز سنتے ہی ''پیاؤں، پیاؤں'' کی آوازیں حلق سے بلند کرتے ہوئے گاڑی گھسیٹنے لگے۔ عطا گاڑی کے پچھلے پائیدان پر کھڑا چابک ہلا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

یہ کون آیا

روما کو جلدی آنے کی ہدایت کرنے کے بعد خان خلیل اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ مگر جب ایک گھنٹے کے بعد اچانک اسے یہ احساس ہوا کہ روما دودھ لے کر ابھی تک نہیں لوٹی ہے تو وہ چونک سا پڑا۔ پہلے اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے اپنی کسی سہیلی سے باتیں کرنے لگی ہو۔ مگر پھر دل نہ مانا اور اس نے اپنے ایک نوکر کو شانو کے گھر دریافت حال کے لیے بھیج دیا۔ نوکر جلد ہی واپس آ گیا اور جب اس نے خالی ہنڈا جس کی تہ میں تھوڑا سا دودھ رہ گیا تھا، خان خلیل کے سامنے رکھ کر بتایا کہ روما کا کہیں پتا نہیں اور یہ ہنڈا اسے پل کے نزدیک پڑا ہوا ملا ہے تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے اسی وقت اپنے تمام نوکروں کو چاروں طرف اس کی تلاش کے لیے دوڑایا۔ روما اس کی ایک ہی بچی تھی۔ اس کے قلب کا سکون اس کی زندگی کا نور۔ وہ خود پاگلوں کی طرح کاشانے میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر بھٹکنے لگا۔ کچھ مہمانوں نے اس سے اس کیفیت کی وجہ بھی معلوم کرنی چاہی لیکن وہ انھیں یہ نہ بتا سکا کہ روما گم ہو گئی ہے۔ نہ ہی اس نے کوئی تک کا جواب دیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے اظہارِ ہمدردی کر کے اس سے پریشانی کا اصل سبب پوچھ ہی لیا۔ اور اس کی گمشدگی کی خبر سنتے ہی ڈاکٹر کا ساتھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور تم باپ ہو کر یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ چلو ہم اسے تلاش کریں۔ میرے پاس دور تک نشانہ مارنے والی بندوق ہے، چلو۔''

''خان خلیل کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ گھبرایا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر نے بھی اپنے ساتھی کو نہیں روکا۔

''میں بھی جاؤں، خالو ابا۔ میرے پاس بھی بندوق ہے۔'' ڈاکٹر کے بھانجے نے بھی اصرار کیا۔

''تم دوسروں کے بھی حوصلے پست کردو گے، کیا فائدہ۔'' زلفی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''کیا تم مجھے بزدل سمجھتی ہو۔'' وہ بگڑ گیا۔

''بھئی، جھگڑو نہیں۔ جسے جانا ہو، وہ جائے۔'' ڈاکٹر نے اکتائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ اور وہ بھی اپنی بندوق کمرے سے نکال کر ساتھ ہولیا۔ انھوں نے لبادے پہن کر ان کے اوپر ہی کارتوس کی پٹیاں لٹکا لی تھیں۔

پل کے پاس ہی سے شورال اور بستی کے درمیانی برفیلے راستے پر انھیں ایک کتوں کی گاڑی کے نشانات مل گئے۔

''یہ... یہ گاڑی یہیں تک آ کر لوٹ گئی ہے۔ ضرور اسے کوئی اٹھا لے گیا ہے۔ اور وہ کوئی دو ٹانگوں والا بھیڑیا ہی ہوسکتا ہے۔'' خان خلیل نچلا ہونٹ دانتوں سے چباتے ہوئے بولا۔

تو چلو۔ وہ جہاں بھی ہوگی ہم ڈھونڈ نکالیں گے۔'' نصرت نے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور وہ ان ہی نشانات پر چل پڑے۔

☆☆☆☆☆☆

کتوں کی گاڑی برف میں دبے ہوئے چنار کے درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک لکڑی کے مکان کے دروازے پر رک گئی۔ اس کی دیواریں ساگون کی لکڑی کے آڑے پٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور چھت برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چھپر کی اولتی سے برف اس طرح لٹک رہی تھی جیسے کسی جادوگر نے ٹپکتے ہوئے دودھ کی دھاروں کو گرتے گرتے جما دیا ہو یا جیسے برگد کی جٹائیں جو ابھی اوپر سے لٹکنا شروع ہوئی ہوں۔ مکان کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ کوئی اندر موجود ہے۔ عطا نے روما کو گاڑی سے اٹھا کر ایک تھیلے کی طرح کاندھے پر ڈال لیا اور اس مکان کے دروازے کو ٹھوکر سے کھولتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

Akram Allahabadi

اندر سامنے ایک لکڑی کی بے ڈھنگی سی میز پر خان اصغر بیٹھا ہوا تھا۔اس کے سامنے انگوری کی ایک صراحی اور ایک کانسے کا گلاس رکھا ہوا تھا۔اس کی آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔

''شاباش۔'' وہ عطا کو روما بدوش دیکھتے ہی چیخا اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جانتا تھا کہ تم خالی نہ لوٹو گے۔''

''لیکن اگر وادی کے لوگوں کو معلوم ہو گیا تو وہ میرے ٹکڑے ہی کر ڈالیں گے۔'' عطا نے منہ بنا کر کہا۔

''کون جان سکتا ہے سوائے ہم دونوں کے؟'' خان اصغر نشے میں جھوم کر بولا۔

''خان تم ایسا کہتے ہوئے خدا کو بھی بھول جاتے ہو۔'' عطا نے اسے ٹوکا۔

''خدا؟ خدا نے ہی تو عورت بنائی ہے۔اور صرف مرد کے لیے۔پھر جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی تو ہے نا۔''

''تم جانو۔میں اتنا پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں کہ ایسی باتیں سمجھ سکوں۔ویسے میرا دل تو یہی بول رہا ہے کہ میں نے اچھا نہیں کہا ہے۔بہر حال دوستی کی خاطر یہ بھی سہی۔'' عطا نے الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ جواب دیا۔اس نے روما کو اسی میز پر ڈال دیا تھا اور وہ ایک بے بس پرندے کی طرح شکاریوں کے سامنے پڑی انھیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔اس کے منہ میں رومال کی لگام لگی ہوئی تھی اور ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔

''کیوں، جان اصغر، ہم خنزیر ہیں نا۔'' اصغر جھوم کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا اور پھر اس نے ایک انگلی سے اس کے پتتے ہوئے رخسار کو چھو کر اس انگلی کو چوم لیا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔لیکن روما کے پیر آزاد تھے۔اس نے تڑپ کر میز پر کروٹ لی اور زور کی لات خان اصغر کے سینے پر ماری کہ وہ حلق سے اوغ کی آواز نکالتا ہوا فرش پر جا گرا۔اس منظر کو دیکھ کر عطا وحشیوں کی طرح قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔لیکن خان اصغر نے اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیا۔وہ

Akram Allahabadi

غصے میں سرخ آنکھوں سے اسے گھورتا ہوا اٹھا اور اس نے بے تحاشا روما کے رخساروں پر تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ مگر دو چار ہی پڑے ہوں گے کہ عطا نے خان اصغر کا ہاتھ تھام لیا۔ روما سسکیاں لینے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔

''اہاں ہاں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ کیا وہ تمہارے بس میں نہیں ہے۔'' عطا نے اسے سمجھایا۔ اور خان اصغر کا ہاتھ رک گیا۔ لیکن وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی چھاتی مسلنے لگا۔ شاید لات کافی زور سے پڑی تھی۔ عطا نے آتشدان سے جلتی لکڑی اٹھا کر اپنا حقہ نما پائپ سلگایا اور پھر ٹہلنے لگا۔ خان اصغر نرم پڑ گیا اور اس نے روما کی پریشان زلفیں اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کے منہ پر بندھا ہوا رومال کھول دیا۔ لیکن منہ سے رومال نکلتے ہی روما نے اصغر کے منہ پر تھوک دیا۔

''کمینے، میرا باپ تمہاری تلاش میں آ ہی رہا ہوگا۔ وہ تمہاری بھوٹیاں کر دے گا۔'' وہ غصے میں کانپ کر بولی۔

''اس کی فکر نہ کرو۔ تمہارا باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اور اگر وہ یہاں پہنچ بھی جائے تو دوسرے دن وادی والوں کو خان خلیل اور اس کی بیٹی کے خون میں لتھڑے ہوئے کپڑوں کی چندھیاں ہی ملیں گی اور وہ ان خونخوار برفستانی بھیڑیوں کو گالیاں دیں گے جو ایک جوان اور خوبصورت لڑکی اور اس کے بوڑھے باپ کو کھا گئے۔'' خان اصغر نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''اوخدا! کیا قاچاریوں کی رگوں میں اتنا ذلیل خون بھی موجود ہے؟'' وہ چھت کی طرف دیکھ کر چیخی۔

''تم بیوقوف ہو لڑکی۔ ایک مرد اور ایک عورت سے ساری دنیا بنی ہے۔ اور دنیا نے عزت اور ذلت کے بہت سے من گھڑت واہمے تراش لیے ہیں۔ تم آج بھی ایک عورت ہو اور اگر تمہیں دلہن بنا کر لاتا تب بھی ایک عورت ہی ہوتیں۔''

''تمہاری ماں بھی ایک عورت تھی۔''

''کیوں نہیں۔اور اسی لیے وہ میرے باپ کے حصے میں آئی تھی۔کل تم بھی ایک ماں ہوسکتی ہو اور میں بھی ایک باپ۔لیکن ایسا نہ بھی ہو تو فطرت کے قانون میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' یہ کہہ کر وہ اس پر جھپٹ پڑا۔روما کے ہاتھ اگر بندھے نہ ہوتے تو وہ مدافعت کرتی۔وہ ایک بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔بے بسی کے عالم میں اس کی مایوس نظریں چھت کو تکنے لگیں۔

''اوخدا، مدد کر میری۔'' وہ گڑگڑائی۔ٹھیک اسی وقت باہر عطا کی گاڑی کے کتے زور زور سے بھونکنے لگے اور وہ دونوں چونک پڑے۔

''شاید کوئی آرہا ہے۔'' خان اصغر نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔تم بے فکر رہو۔'' یہ کہتا ہوا عطا ایک کونے میں ٹکی ہوئی رائفل سنبھال کر باہر نکل گیا۔

لیکن کتے تو اب بھی بھونکتے جارہے تھے اور اسے حدنظر تک کسی انسان کا وجود بھی نظر نہ آیا۔پھر وہ احتیاطاً مکان کے عقب کی طرف بھی ریکھنے چلا گیا۔

کتے برابر بھونک رہے تھے۔پھر ایک بار اس مکان کا لکڑی کے پٹوں والا دروازہ جھٹکے سے کھل کر زور سے بند ہوا اور اس کی آواز نے خان اصغر کو بری طرح چونکا دیا۔اس نے پاس ہی پڑی ہوئی رائفل اٹھالی اور اس کا رخ دروازے کی طرف کر کے پکارا۔

''کون ہے؟ اندر آؤ۔اور، روما، تم نے حلق سے آواز بھی نکالی تو گولی ماردوں گا۔''

وہ بولا۔

لیکن کوئی اندر نہیں آیا۔صرف تیز ہوا سے دروازہ کھلتا بند ہوتا رہا۔

''اوہ۔میں بھی کتنا وہمی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رائفل رکھ دی۔لیکن اتنی دیر میں جھپٹ کر روما دروازے تک پہنچ چکی تھی۔پھر بھی وہ باہر نہ نکل سکی۔کیوں کہ خان اصغر نے کسی بھیڑیے کی طرح اپنے شکار پر جست کی اور اسے دبوچ لیا۔روما نے اس کے ہاتھ میں کاٹ

لیا۔لیکن آج اس پر شیطان سوار تھا۔اس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی بلکہ روما کے منہ پر اس نے ایک تھپڑ اس زور کا مارا کہ اس کے منہ سے خون نکل پڑا۔لیکن نہ جانے اسی وقت اسے کیا ہوا جو وہ روما پر سے اچھل کر الگ ہٹ گیا۔اور اپنی رائفل کی طرف لپکا۔روما نے تیزی سے فرش سے اٹھ کر ایک طرف ہٹتے ہوئے آنے والے کو دیکھا۔اور فرط مسرت سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس کے لبوں سے شدت جذبات سے آواز تک نہ نکل سکی۔وہ وہی موسم بہار کا مہمان تھا۔اپنے اسی مخصوص لباس میں۔وہ خان اصغر کو گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

''آگے نہ بڑھیے۔اس کمینے کے پاس رائفل ہے۔'' روما چیخی۔لیکن اس نے جیسے سنا بھی نہیں۔

''تمہاری موت ہی آج تمہیں یہاں لے آئی ہے،اجنبی۔میں کب سے تمہارے گریباں پر ہاتھ ڈالنے کا منتظر تھا۔'' خان اصغر رائفل کا نشانہ اس کے سینے پر لیتے ہوئے دھاڑا۔لیکن اجنبی مہمان نے جیسے اس کے الفاظ بھی نہیں سنے اس کے قدم نہیں رکے۔

اچانک اس برفستانی پہاڑی کی پرسکوت فضا رائفل کے فائروں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔اور مکان کی پشت پر ٹہلتا ہوا عطا تیزی سے دروازے کی طرف دوڑا۔

خان اصغر اندھا دھند اجنبی پر فائر کر رہا تھا،متواتر۔لیکن یہ دیکھ کر خود اس کے ہاتھ کانپنے لگے کہ اجنبی مہمان کو ایک بھی گولی نہیں لگی۔اگر لگی ہو تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔اور جیسے ہی دروازہ کھول کر عطا نے اپنی رائفل سے اس اجنبی پر،جس کی پشت اس کی طرف تھی، گولی چلائی،خود خان اصغر کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی عطا کے سینے پر پڑی اور عطا کی رائفل کی گولی خان اصغر کے سینے پر۔وہ دونوں ہی گر پڑے۔اور ان کے درمیان مہمان سر سیدھا کیے کھڑا تھا۔

''تم لوٹ جاؤ۔'' اس کی بھاری کھنکتی آواز روما کے کانوں سے ٹکرائی۔اور وہ چونک پڑی۔

''مگر آپ؟'' روما نے کہنا چاہا۔

''میر فکر نہ کرو۔تم لوٹ جاؤ۔اور سنو تم کسی سے یہ نہ کہو گی کہ میں تمہاری مدد کو آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو گولی مار کر ہلاک ہوئے ہیں۔''اس نے اپنے الفاظ دہرائے۔اور روما کی مجال نہ ہوئی کہ پھر کچھ اور کہے۔اس نے لبادے کی آستین سے نچلے ہونٹ کا خون پونچھا اور خموشی سے باہر نکل گئی۔باہر کتوں کی گاڑی موجود تھی۔لیکن سب سے حیرت ناک بات جو اس نے دیکھی وہ یہ کہ اس مکان کے دروازے کی طرف دیکھ دیکھ کر وہ کتے ''کوں کوں'' کی آوازیں حلق سے نکال کر وہیں دم ہلا رہے تھے۔روما پیدل ہی بستی کی طرف چل دی۔

.....

شام تک تمام بستی میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ نہ جانے کس بات پر عطا اور خان اصغر آپس میں لڑ پڑے اور انھوں نے ایک دوسرے کو گولی مار دی۔روما کی گم شدگی کی خبر کا شانے سے آگے نہ بڑھ سکی۔اور بعد میں اس کے لیے بھی لوگوں کو یہی معلوم ہو سکا کہ وہ شورال کی طرف اپنی ایک سہیلی کے ساتھ چلی گئی تھی۔اور خود ہی لوٹ بھی آئی۔یہ راز تو صرف روما کو معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی تھی اور خان اصغر اور عطا کا کیا حشر ہوا۔اس نے اس بارے میں اپنی زبان بالکل بند کر لی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

ایک عجیب بات

شہری مہمان شام کی چائے کے بعد پھر اپنے برآمدے میں کرسیوں پر جمے ہوئے تھے اور زلفی ڈاکٹر کے بھانجے کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''بے چارے، بہادری دکھانے گئے تھے بندوق لے کر اور لوٹ آئے خالی ہاتھ۔''

''نہیں تو کیا شیر مار کر لاتا؟'' وہ جھنجھلا کر بولا۔

''بھئی، اس میں ہم لوگوں کا کیا قصور، وہ لڑکی خود ہی واپس آ گئی۔'' ڈاکٹر کے ساتھی نصرت نے کہا۔

''مجھے تو اس بات پر یقین نہیں آتا۔ صبح کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا جسے خان خلیل بھی چھپا رہا ہے۔''

''بالفرض اگر ایسا ہو بھی، تو ہمیں کیا۔ وہ جانے اس کی بیٹی جانے۔''

''بھائی نصرت کو اس لڑکی سے ضرور کچھ ہو چلا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا کتنی جلدی بندوق لے کر تیار ہو گئے تھے۔'' ڈاکٹر کی مسز نے نصرت کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''شکل سے پیدائشی رومیو معلوم ہوتے ہے، بیچارے۔'' ڈاکٹر نے اپنی شریک حیات کی تائید کی اور نصرت برا ماننے کے بجائے مسکرا دیا۔

''اپنی شان میں مجھے اس قسم کے تبصروں سے خوشی ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔

''کیوں نہ ہو۔ بے حیائی تیرا آسرا۔''

''ڈیڈی، آپ نصرت بھائی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' زلفی نے بھی اس پر وار کیا۔

Akram Allahabadi

''محبت کرنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔اس میں شرمندگی کا کیا سوال۔''نصرت نے ڈھٹائی سے کہا۔

سردی کی شدت بڑھ چلی تھی۔ویسے غروب آفتاب میں ابھی بہت وقت تھا۔لیکن کہرائی ہوئی سہ پہر بھی شام ہی معلوم ہوتی ہے۔

مہمان دہکتی انگیٹھی کے منتظر تھے اور کچھ دیر بعد ہی روما ایک نوکر سے انگیٹھی اٹھوائے آپہنچی۔وہ آج بہت خوش نظر آرہی تھی۔چہرہ لال لال ہو رہا تھا۔

''دوسری انگیٹھی ابھی نوکر لا رہا ہے۔''اس نے بتایا۔''اور ہاں، میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے تلاش کرنے میں آپ نے میرے بابا کا ساتھ دیا۔''وہ نصرت اور ڈاکٹر کے بھانجے کی طرف دیکھ کر بولی۔

''لیکن ہمیں تو افسوس ہے کہ ہم آپ کے کسی کام نہ آسکے۔''نصرت نے کہا۔خلاف معمول اس وقت اس نے اسے تم کی بجائے آپ سے مخاطب کیا۔

''بھئی، نیت تو کام آنے کی ہی تھی نا۔اور اچھا ہوتا جو تم کام آگئے ہوتے۔''ڈاکٹر کے اس جملے پر زلفی کو اپنی ہنسی منہ چھپا کر روکنی پڑی۔اور خود روما کو بھی ہنسی آگئی۔اس نے سر جھکا لیا۔بڑی جان لیوا ادا تھی اس کی یہ نصرت کے لیے۔وہ سنجیدگی سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔

''ہم تو ڈر گئے تھے کہ کہیں تمہیں بھیڑیے تو نہیں اٹھا لے گئے۔''ڈاکٹر کی مسز نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔''تمہارے بابا تو اسی طرح گھبرائے ہوئے تھے۔''

''بھیڑیے؟''روما نے زیر لب دوہرایا۔''جی ہاں۔دراصل وادی میں اگر کوئی گم ہو جاتا ہے تو لوگ ایسا ہی سمجھنے لگتے ہیں۔''وہ بولی۔

''خیر، خدا کا شکر ہے تم صحیح سلامت لوٹ آئیں ورنہ نہ جانے خان خلیل کا کیا حال ہوا ہوتا۔''ڈاکٹر نے چہکارنے والے انداز میں کہا۔

''مجھے ہوا بھی کیا تھا؟''روما نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔لیکن وہ اپنی

پھیکی ہنسی کو نصرت کی نظروں سے نہ چھپا سکی۔ پھر بھی وہ کچھ بولا نہیں۔ شاید مصلحتاً۔

اور اچانک ان سب کی ہی نظریں اجنبی مہمان کے کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ باہر نکل کر دروازہ بھیڑ چکا تھا۔ وہی ایک جیسا لباس اور شفاف گورے چہرے پر وہی عجیب سی دلکش مگر آدھی مسکراہٹ۔ اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور روما کی نگاہیں تو جیسے ہی اس سے ٹکرائیں، اس فرط جذبات سے جھرجھری سی آ گئی۔ مگر وہ کسی سے کچھ بولا نہیں اور آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

''ذرا سنیے تو، مسٹر۔'' ڈاکٹر نے خود اسے ٹوک دیا۔ وہ ٹھہر گیا اور پلٹ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

''تشریف لائیے نا۔'' ڈاکٹر خود ہی اسکے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک لمحے وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر پلٹ کر ان کے قریب آ گیا۔ ڈاکٹر کے بھانجے نے فوراً اس کے لیے کرسی چھوڑ دی۔

''ہم اتنے قریبی پڑوسی ہو کر بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں، یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی۔'' ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ ''کیا آپ اسے پسند کرتے ہیں؟'' اس نے اجنبی مہمان سے پوچھا۔

جواب میں اس کی مسکراہٹ اور پھیل گئی۔ وہ اب خالی نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ لیکن نشست ترچھی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کی مسز کی طرف اس کی پشت تھی۔

''مجھے ڈاکٹر زیدی کہتے ہیں۔ اور یہ، یہ ہیں میرے بھانجے راشد، یہ میرے دوست مسٹر نصرت، یہ میری بیٹھی زلفی۔'' ڈاکٹر خود ہی اس سے اپنا تعارف کرانے لگا۔ لیکن وہ صرف سر ہلاتا گیا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ کسی کی طرف نہیں بڑھایا۔ حالاں کہ زلفی نے خود ہی اپنا ہاتھ بڑھایا تھا اور بعد میں وہ محجوب سی ہو کر رہ گئی۔

''اور یہ،... یہ ہیں میری شریک حیات، یعنی میری مسز۔ ان کا نام افسر جہاں ہے۔''

Akram Allahabadi

ڈاکٹر نے سب سے آخر میں اپنی بیوی کا بھی تعارف اس سے کرایا۔مگر جیسے ہی وہ مسز زیدی کی طرف پلٹا۔خدا جانے اس کی شکل دیکھتے ہی حیرت سے مسز زیدی کی آنکھیں کیوں پھیل گئیں۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں۔لیکن ان کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ بتا رہا تھا کہ وہ اس سے خوفزدہ ہیں۔

''آ...آپ کا نام؟''انھوں نے اپنے ایک ہاتھ کی کانپتی ہوئی انگلی اس کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

''میرا نام شہاب ہے۔''نوجوان اجنبی کی مترنم آواز سنائی دی۔وہ مسکرا رہا تھا۔مگر نہ جانے کیوں اس نام کو سنتے ہی مسز زیدی کے منہ سے ایک بھیانک سی چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔

''ارے ارے، یہ کیا ہوا؟''ڈاکٹر بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔اور سب ہی مسز زیدی کی طرف دوڑ پڑے حتیٰ کہ روما بھی۔

''بیہوش ہو گئی ہیں شاید۔''ڈاکٹر نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔''ذرا سا پانی منگائیے۔''یہ کہہ کر اسے ہوش میں لانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد ہی مسز زیدی کو ہوش آ گیا۔لیکن آنکھیں کھولتے ہی وہ خوف زدہ نظروں سے ان میں وہی چہرہ تلاش کرنے لگی،اس اجنبی کا۔اور اس وقت ہی دوسروں کو بھی یہ احساس ہوا کہ اس اجنبی کی شکل دیکھ کر اسر اس کا نام پوچھ کر ہی ان کی یہ کیفیت ہوئی تھی۔وہ بھی پٹ کر اس اجنبی مہمان کو تلاش کرنے لگے۔لیکن وہ انھیں نظر نہ آیا۔کوئی کچھ نہ سمجھ سکا اور جب تک کہ انھیں یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اسے دیکھ کر مسز زیدی کی یہ کیفیت کیوں ہو گئی تھی، کچھ کہنا ناممکن تھا۔

''مجھے کمرے میں لے چلیے۔''مسز زیدی شوہر کے کندھے کا سہارا لے کر اٹھنے لگیں۔

Akram Allahabadi

''ہاں ہاں، چلو۔'' ڈاکٹر اسے لے چلا۔ اور دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ البتہ روما وہیں انگیٹھی کے پاس کھڑی رہی۔ حیران وہ خود بھی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر اس وقت حیرت سے زیادہ مایوسی برس رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ اجنبی مہمان نے اس سے مخاطب ہونے کی بھی ضرورت نہ سمجھی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جھجے تک آ پہنچی۔ اس نے دائیں سمت جنت کے پل کے مشرق میں دیکھا۔ وہ شورال کے مشرقی حصے کی طرف بلند ہوتے ہوئے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اسی پروقار انداز سے۔ کبھی کہر کی دھند میں چھپتا اور کبھی نظر آتا۔ اور... پل سے دور مکانوں کے چھجوں سے قاچاری دوشیزائیں سر نکال نکال کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ پل کے نزدیک برفیلے میدان میں بھی لبادے پہنے کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کی نگاہیں اس اجنبی مہمان کا پیچھا کر رہی تھیں اور زبانیں شاید اسی کا ذکر چھیڑے ہوئے تھیں۔ اس نے ایک لمبی سی سرد سانس کھینچی اور اس کی پلکیں نمناک ہو گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر اسی طرف گیا ہوگا۔ شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے وہ اکثر اسی راستے پر اکیلا نہ جانے کہاں جایا کرتا تھا۔ شاید تفریح کرنے۔ لیکن یہ اگر تفریح تھی تو پھر وہ واقعی ایک معمہ تھا۔ کم از کم شورال کا یہ رستہ تو صرف موسم گرما میں ہی استعمال ہوتا تھا۔ اور وہ بھی خشک میوے خچروں پر لے جانے والے خطر پسند تاجر ہی استعمال کرتے تھے۔ برف کے دنوں میں شورال کی مشرقی سمت بہت مخدوش ہوتی تھی۔ ادھر نہ صرف یہ کہ برف کے تودے لڑھکا کرتے تھے بلکہ پہاڑ کا کٹاؤ اس قسم کا تھا کہ ایک بار پھسل کر آدمی نشیب میں ہی جا گرا۔

اجنبی مہمان کا سایہ مدھم پڑتے پڑتے کہر کی چادر میں مدغم ہو گیا اور روما سر جھکا کر لوٹنے لگی۔ وہ کسی گہری سوچ میں کوئی ہوئی تھی۔ مگر ڈاکٹر زیدی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے۔ وہ دروازے کے پٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اندر جو گفتگو ہو رہی تھی وہ تھی ہی ایسی کہ خواہ مخواہ اسے رک جانا پڑا۔ کمرے میں

مسز زیدی آرام کرسی پر نیم دراز تھیں اور ڈاکٹر ان کے پاس ہی ایک اسٹول پر ان کی طرف جھک کر بیٹھا ہوا تھا۔باقی لوگ آس پاس کھڑے تھے۔مسز زیدی کہہ رہی تھیں۔

''یہ ناممکن ہے،ایسا نہیں ہوسکتا۔یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''آخر کیا کیسے ہوسکتا ہے؟''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''ڈاکٹر جھنجھلایا۔

''میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔میرے سامنے اس کا جنازہ اٹھایا گیا تھا۔وہ...وہ...'' کہتے کہتے مسز زیدی کی آنکھیں پھر حیرت وخوف سے پھیلنے لگیں۔

''تم کس کا ذکر کر رہی ہو،ممی؟''زلفی نے پریشان لہجہ میں پوچھا۔تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

''مگر اس کی آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔میں نے مرتے دم اس کی آنکھوں میں جو ویرانی دیکھی تھی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔اومیرے خدا،کبھی نہیں۔''وہ پاگلوں کی طرح سر کو جھٹک کر بولی۔

''خالہ بی کو ضرور کچھ ہوگیا ہے،خالوں ابا۔''ڈاکٹر کے بھانجے نے مسز زیدی کی کیفیت سے متاثر ہوکر کہا۔

تمہارسر۔''ڈاکٹر نے بیزاری سے کہا۔اور پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

مگر چند لمحوں کے بعد مسز زیدی کی کیفیت اعتدال پر آگئی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ دو آدمی ایک ہی جیسی شکل کے ہوں؟''مسز زیدی نے مری ہوئی سی آواز میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔کیوں نہیں۔اکثر ایسا ہوا ہے۔''ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر شاید....''وہ کہتے کہتے رک گئی۔شاید مجھے دھوکا ہو رہا ہو۔

''مگر کس بات کا دھوکا؟''ڈاکٹر نے اپنا سوال دوہرایا۔

Akram Allahabadi

''وہ اجنبی مہمان ۔اس کی شکل پرویز سے کتنی ملتی جلتی ہے ۔بالکل ویسی ہی ۔''
مسز زیدی نے شوہر کو بتایا۔

''پرویز؟'' ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔''اوہ۔'' اسے جیسے یاد آ گیا۔''ہُم...مگر وہ کتنے زمانے کی بات ہے ۔تم بھی کیا حماقت لے بیٹھیں ۔''

''مجھے تو آج بھی وہ کل ہی جیسی بات معلوم ہوتی ہے ۔'' مسز زیدی بڑبڑائیں ۔

''میں اس تذکرے کو سننا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر نے برا ماننے والے لہجے میں کہا ۔

''تو...تو آج تک آپ کی بدگمانی نہیں گئی؟'' مسز زیدی نے شوہر کو تذبذب بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ۔انھیں بوڑھا ڈاکٹر اس وقت پھر بیس پچیس پہلے کا ڈاکٹر زیدی نظر آنے لگا تھا ۔ایک شکی اور ضدی آدمی ۔جسے شادی کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی نوجوان بیوی شادی سے پہلے کسی دوسرے کی محبت کا دم بھرتی تھی تو وہ اس قدر چراغ پا ہو گیا تھا کہ کئی مہینوں تک اس نے اس سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ۔پھر وہ زخم رفتہ رفتہ مندمل ہوتے گئے ۔اور وہ اپنی ازدواجی زندگی میں پچھلی تمام باتیں بھول گئے ۔کیوں کہ ان کے درمیان زلفی آ گئی تھی ۔ان کی اکلوتی اولاد جسے دونوں ہی بہت چاہتے تھے ۔اس نے ان کی زندگی کا کھویا ہوا سکون انھیں لوٹا دیا تھا ۔ویسے یہ بھی صحیح تھا کہ مسز زیدی (جو ان دنوں اپنے بھائی بہنوں میں باجی نزہت کہلاتی تھیں) کی شادی بھی ڈاکٹر زیدی جیسے ۴۵ سالہ آدمی سے جب وہ بیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھیں، اس وقت صرف اس وجہ سے کر دی گئی تھی کہ ان کے ہی کالج کے ایک پروفیسر سے ان کے رومان کی بدنامی اندر ہی اندر پھوٹ پڑی تھی ۔اور اگر شادی کے بعد یہ راز ڈاکٹر پر کھل جانے پر وہ پرویز کے وہ خطوط ڈاکٹر کو نہ دکھا دیتیں، جن میں اس نے ان کی محبت کی پیشکش کو بڑے پاکیزہ اور سلجھے ہوئے پیرائے میں لوٹا دیا تھا تو شاید ڈاکٹر زیدی سے ان کا پھر کبھی ملاپ نہ ہوتا ۔وہ اس پروفیسر سے تو واقف نہ تھے البتہ یہ جان کر انھیں قدرے سکون ضرور نصیب ہو گیا تھا کہ پروفیسر پرویز زیادہ دن تک زندہ نہیں رہا ۔وہ ان کی شادی کے

کچھ عرصے بعد ایک دن اچانک موت کا شکار ہو گیا تھا۔ پھر بھی جب کبھی اس کا تذکرہ چھڑ جاتا تو ڈاکٹر کو سخت ناگوار گزرتا۔ وہی پچھلی بدگمانی پھر تازہ ہو جاتی اور وہ منہ پھلا لیا کرتا۔ آج بھی اتفاقاً وہی تذکرہ چھڑ گیا تھا۔ حالاں کہ اس عمر کو پہنچنے کے بعد مسز زیدی یہ سمجھنے لگی تھیں کہ ڈاکٹر ان باتوں کو مطلق بھول چکا ہوگا وہ اب بدل چکا ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مرد کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ اور خصوصاً ایسے معاملات میں تو وہ لبِ مرگ بھی رقابت کے جذبات سے احتراز نہیں کر سکتا۔

''آپ خواہ مخواہ منہ پھلا رہے ہیں۔ میری بات تو سنیے۔''

''کیا سنوں، تم پھر اس شخص کا تذکرہ لے بیٹھیں جو اگر آج بھی میرے سامنے ہوتا تو میں اس کا سر توڑ دیتا۔'' ڈاکٹر کے بڑھاپے میں بھی جنون چڑھ آیا۔

''ڈیڈی؟'' زلفی نے ماں کی طرف داری کرتے ہوئے باپ کو ٹوکا۔ ''آپ موقع و محل تک نہیں دیکھتے اس طرح ریش ہو جاتے ہیں۔''

''تم ہی سنو۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔'' یہ کہتا ہوا ڈاکٹر اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ اور مسز زیدی کی پلکیں نمناک ہو گئیں۔ نصرت اٹھ کر ڈاکٹر کو سمجھانے کے لیے اس کے پیچھے چل دیا۔

''ممی، آج تو آپ کو یہ بات بتانی ہوگی۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار کسی ایسے آدمی کے ذکر پر آپ دونوں کو لڑتے دیکھ چکی ہوں۔'' زلفی نے ماں کے پیچھے پڑتے ہوئے کہا۔

''یہ بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے، بیٹی، جب میں تمہاری طرح جوان تھی۔ اورینٹل کالج میں پڑھتی تھی۔ میں نے تمہارے ڈیڈی سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ مجھے اس سے محبت تھی۔'' مسز زیدی بیٹی کو سہیلی کی طرح سمجھتے ہوئے اپنی کہانی بیان کرنے لگیں۔ اور ویسے بھی وہ اتنے ہی آزاد خیال تھے کہ جوان اولاد کے سامنے اس قسم کی گفتگو ان کی سوسائٹی میں معیوب نہ سمجھی جاتی تھی۔ ڈاکٹر بھی پہلے کافی مغرب پسند تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں بیوی کے اس

راز کے جان لینے کے بعد وہ کٹر مشرقی قسم کا شکی اور چڑچڑا آدمی ہو گیا تھا۔

''ان کا نام پرویز تھا۔ وہ ہسٹری کے پروفیسر تھے اور کالج میں شاید ان سے زیادہ باوقار اور سنجیدہ شخصیت کوئی نہ تھی۔ مگر... مگر یہ میرا ہی قصور تھا کہ ان کے اچھے سلوک کو غلط سمجھ کر ان کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ وہ ہر سال سردیوں کی تعطیل میں کہیں باہر چلے جایا کرتے تھے۔ میں نے جذبات پر قابو پا کر انھیں جو خطوط لکھے انھوں نے ان کا جواب دیا۔ مگر ایسا جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کو برے بھلے کی تمیز بتایا کرتا ہے۔ اور پھر بھی مجھے وہ دل سے عزیز رہے۔ البتہ میرے چند خطوط پکڑے گئے اور اسی لیے تمہارے نانا نانی نے بدنامی سے بچنے کے لیے ۴۵ سال کے ان ڈاکٹر صاحب کے ساتھ فوراً میری شادی کر دی۔ یہ ڈاکٹری کرتے کرتے بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے بڑی جلدی اس رشتے کو قبول کر لیا تھا۔''

''اور ان پروفیسر صاحب کا کیا ہوا پھر؟''

''ہماری شادی کے کئی دن بعد مجھے ان کے نوکر سے معلوم ہوا کہ وہ کہیں شکار وغیرہ پر گئے تھے اور وہاں سے ایک مہینے کے بعد اچانک ایک دن بری طرح زخمی حالت میں گھر لائے گئے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں انھیں دیکھنے چلی گئی۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ انھیں کچھ مچھیروں نے سرجوندی سے نکالا تھا۔ وہ اس کے دھارے میں بہتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ اور وہیں کے کسی آدمی نے انھیں پہچان بھی لیا تھا۔ اس لیے وہ لوگ سیدھے انھیں گھر لے آئے۔ مگر وہ چند گھنٹے بھی زندہ نہ رہے۔ انھوں نے میرے سامنے دم توڑا تھا۔ ان کی آنکھیں پھیل کر ٹھنس گئی تھیں اور ان میں ایک عجیب سی ویرانی جھانک رہی تھی۔ بیٹی، ان کی شکل اس اجنبی مہمان سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ اور یہی میں تمہارے ڈیڈی سے کہہ رہی تھی جس پر وہ ناراض ہو گئے۔'' مسز زیدی نے بتایا۔

''یہ آپ کا وہم ہوگا، خالہ بی۔ جب بیس پچیس سال کی بات ہے تو ہو سکتا ہے ان کی شکل بھی آپ کو ٹھیک سے یاد نہ رہی ہو اور اس مہمان کو دیکھ کر محض آپ کو دھوکا ہوا ہو۔'' ڈاکٹر کا

بھانجہ بھی بولے بغیر نہ رہا۔

''ہاں، ممی۔'' زلفی نے بھی اس کی تائید کی۔

''نہیں، بیٹے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں ان کی ویران آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں اس چہرے کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر یہ مماثلت محض اتفاقیہ ہی ہوسکتی ہے۔'' زلفی نے ڈاکٹر کے الفظ دوہرائے۔

''ہاں۔ شاید۔'' مسز زیدی کھوئے ہوئے انداز میں بولیں۔

''ڈاکٹر کے باہر آنے سے پہلے ہی روما دروازے سے ہٹ کر زینے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر اس اس کی بیوی کو خبطی سمجھ رہی تھی۔ اور ہو بھی کیا سکتے تھے۔ وہ لوگ جو ایک ایسی شخصیت کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگیں جسے انھوں نے پہلی بار ہی دیکھا ہے۔ اسے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں زبردستی اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ آخر انھیں اس سے واسطہ ہی کیا۔ ہونہہ، اس نے منہ ٹیڑھا کر کے سر کو جھٹکا۔ مگر اپنی اس کھوئی ہوئی سی کیفیت پر وہ اپنے ایک نوکر کو مسکراتے دیکھ کر چونک پڑی۔

''بابا خان بلا رہے ہیں آپ کو۔'' نوکر نے، جو زینے کے پاس ہی نیچے ہال میں کھڑا تھا، اسے بتایا۔

اور وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر ہال سے گزرتی ہوئی خان خلیل کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ خان خلیل ایک رجسٹر پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔

''تم آگئیں، بیٹی۔ بیٹھو۔'' اس نے روما کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اور وہ چپ چاپ اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''بچے اپنے ماں باپ سے جھوٹ نہیں بولا کرتے۔'' وہ کہنے لگا۔ اور روما چونک پڑی۔

''میں سمجھی نہیں، بابا؟''

Akram Allahabadi

''تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ تمہاری مدد کس نے کی تھی۔ میں اس بہادر اور شریف آدمی کا احسان ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی، بابا۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو، بچی۔ تم مجھ سے ہی چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ حالاں کہ میں تمہارا باپ ہوں۔''

''مگر، بابا...''

''وہ اگر شادی شدہ نہ ہوا تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں گا۔''

''چاہے وہ قاچاری نہ ہو؟'' روما کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اور خان خلیل اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ روما کو جھینپ جانا پڑا۔ اس کا جھوٹ کھل گیا تھا۔

''ہاں۔ چاہے وہ اس دنیا کا بھی باشندہ نہ ہو۔'' اس نے وعدہ کیا۔ مگر روما سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔

''اب بتا دو، بیٹی۔ یہ تو تم قبول ہی کر چکی ہو کہ وہ قاچاری نہیں ہے۔'' خان خلیل بولا۔

''میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں کسی کو نہ بتاؤں گی۔'' روما نے کہا۔

''اچھا کیا وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھیوں میں سے کوئی ہے؟'' خلیل نے پوچھا۔ جس پر روما نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''شہری مہمانوں میں سے کوئی؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ اور اس پر بھی روما نفی میں سر ہلایا۔

''تو اور کون ہو سکتا ہے۔'' خلیل خان چونے لگا۔ ''کک... کیا... وہ؟'' وہ سر اٹھا کر روما کی شکل دیکھنے لگا۔ لیکن خود اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''مگر... وہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟''

Akram Allahabadi

''کون نہیں ہوسکتا؟'' روما نے چونک کر پوچھا۔

''ہمارا موسم بہار کا مہمان۔'' خلیل بولا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟'' روما نے حیرت سے پوچھا اور خان خلیل کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''دیکھا۔ معلوم کرلیا نا میں نے۔'' وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔ اور روما جوتے کی ٹھوکر سے زمین کریدنے لگی۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟'' خان خلیل دوبارہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا؟'' روما کے چہرے پر آئی ہوئی سرخی پھر پھیکی پڑنے لگی۔

''یہی کہ وہ رہا ہو۔ ہم تو اسے یہاں کمرے میں سوتا چھوڑ کر گئے تھے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے عمر رسیدہ ملازم نزورو کو آواز دی، جو فوراً ہی آ پہنچا۔

''کیا صبح ہمارے جانے کے بعد اوپر کے سرے والے کمرے کا مہمان کہیں گیا تھا؟''

''جہاں تک مجھے یاد ہے ہے آپ کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے کمرے میں آرام کررہے تھے۔ ویسے اگر میرے دیکھنے کے بعد کہیں گئے ہوں تو کہہ نہیں سکتا۔ میں پھر کاموں میں مشغول ہوگیا تھا۔'' ملازم نے بتایا۔

''خدا جانے۔'' خان خلیل تذبذب کا شکار ہوکر جھنجھلائے ہوئے بولا۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھا تھا، بابا۔ انھوں نے مجھ سے باتیں بھی کی تھیں۔'' روما نے باپ کو یقین دلایا۔

''تو پھر آدمی کیا ہوا، چھلاوہ ہوگیا کہ ہم لوگوں کو نکلنے کے بعد سو کر اٹھے اور وقت پر تمہاری مدد کر بھی پہنچ جائے۔ اس کے طریقے واقعی بڑے پراسرار ہیں۔''

''بعض لوگ چھپ چھپ کر بھی نیکیاں کرتے ہیں۔'' روما نے دبی زبان سے کہا۔

Akram Allahabadi

''اب تم مجھے خلیفہ ہارون الرشید کی کہانیاں سنانے لگو گی ۔اچھا جاؤ۔ میں اپنے وعدہ پر قائم رہوں گا۔ میں خان نواز نہیں ہوں۔'' بوڑھا خان بیٹی کو دیکھ کر مسکرایا اور شرم سے سرخ چہرہ لیے سر جھکائے وہ اس کے کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد وہ تمام کام چھوڑ کر موسم بہار کی تتلی کی طرح کاشانے کے عقبی میدان میں برف پر خوشی سے ناچ رہی تھی ۔اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنی منزل کو پا لیا ہو۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

دوہرا معمّہ

شام ہو چکی تھی۔اور اندھیرا چھاتا چلا جا رہا تھا۔برآمدے کی فینسنگ پر جھکی ہوئی زلفی دور خلا میں بکھرے ہوئے سرمئی اندھیرے میں گھور رہی تھی، جو بتدریج گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔اور اس وقت ڈاکٹر کے ساتھیوں میں دو شہری مہمانوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔یہ لوگ شاید ڈاکٹر سے بھی پہلے یہاں آ کر ٹھہرے ہوئے تھے۔لیکن ان سے آج ہی ڈاکٹر کی دوستی ہوئی تھی اور اس نے انھیں شام کی چائے پر مدعو کر لیا تھا۔مسز زیدی اپنی نشست پر سمٹی بیٹھی تھیں۔ان کے پیروں پر ایک گرم کشمیری شال پڑا ہوا تھا۔نصرت ڈاکٹر کے پاس والی نشست پر اور دونوں نئے مہمان انگیٹھیوں کے دوسری طرف بیٹھے تھے۔ان میں اس برف سے ڈھکی ہوئی خوبصورت وادی کے بارے میں ہی گفتگو ہو رہی تھی۔اور یہ گفتگو کیوں کہ زلفی کے لیے اکتا دینے والی تھی، اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر آ گئی تھی۔یا شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ان نئے مہمانوں میں سے ایک اسے بری طرح گھور رہا تھا۔اس کا ذہن اس وقت اپنی ماں کی بیان کی ہوئی اس داستان میں الجھا ہوا تھا۔جس نے اس کے ماں باپ کے درمیان نا خوشگوار احساسات کی ایک خلیج حائل کر دی تھی۔اسے اس وقت بھی اپنی ماں پر ہی رحم آ رہا تھا۔بھلا یہ کون سی عقل مندی تھی کہ جب اس شخص کو مرے ہوئے بیس پچیس سال گزر چکے ہیں، اس کے ذکر پر ڈاکٹر اس طرح بھڑک اٹھے جیسے وہ کل کی ہی بات ہو۔کچھ بھی ہو زیادتی ڈیڈی کی ہی ہے۔مگر سوچتے سوچتے کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ڈاکٹر کا بھانجہ اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔زلفی نے اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر پھر منہ پھیر لیا۔وہ قریب آ گیا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ یہاں آنے کے بعد تمہیں مجھ سے کچھ نفرت سی ہوتی جا رہی ہے۔“ وہ قریب ہو کر بولا۔

''اور اگر میں ہاں کہہ دوں تو ؟'' زلفی نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو اس کا سبب یقیناً وہ موسم بہار کا مہمان ہی ہوگا۔ بہت خوبصورت ہے نا؟'' جلے ہوئے انداز میں راشد کے منہ سے نکلا۔

''کیا مطلب؟'' زلفی نے چونک کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''وہ مجھ سے زیادہ تم جانتی ہو۔ تم اس کی ذات سے جس قدر دلچسپی لے رہی ہو وہ دوسروں کی آنکھوں سے چھپی ہو تو ہو، لیکن میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔''

''اوہ۔ تو تمہیں شک ہو رہا ہے؟''

''کیوں نہیں، تم میری منگیتر ہو۔''

''مگر زر خرید کنیز نہیں ہوں آپ کی۔''

''آں؟ ہاں ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے ہٹ کر آگے نکل گیا۔

زلفی پلٹی ہی تھی کہ اس کی نظر زینے پر پڑ گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی جس کے لیے راشد نے اس پر طنز کیا تھا وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ زلفی کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے واقعی وہ اس کی طرف کھنچی جا رہی ہو۔ راشد تو اس کے سامنے اتنا حقیر نظر آتا تھا جیسے شیر کے سامنے لومڑی۔ وہ زینے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ زلفی اسے تکتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے قریب ہو جائے۔ مگر اجنبیت اور خودداری کی دیوار درمیان میں حائل تھی۔ اجنبی مہمان نے اوپر آتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اور زلفی بے خودی ہو گئی۔ وہ پراسرار چمک جو اس اجنبی مہمان کی خوبصورت آنکھوں میں تھی، کتنی پرکشش تھی وہ، کس قدر مقناطیسی۔

غیر ارادی طور پر وہ کچھ آگے بڑھ آئی۔

''ہیلو، فرینڈ۔'' ڈاکٹر نے دور ہی سے اجنبی مہمان کو دیکھ کر مخاطب کیا۔ اور وہ صرف مسکرا دیا۔ ''آیئے نا۔ آپ تو شاید ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔'' ڈاکٹر نے اپنی

نشست سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا۔اجنبی مہمان پہلے تو کچھ ہچکچایا پھر اس نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔مگر ڈاکٹر اسے گرم جوشی سے دباتے ہوئے کچھ چونک پڑا۔اس نے ایک بار اور اس ہاتھ کو دبایا اور چھوڑ دیا۔وہ کچھ کھویا کھویا سا نظر آنے لگا۔اجنبی بدستور مسکرا رہا تھا۔اس کی نظر یہاں موجود لوگوں پر سے ہوتی ہوئی مسز زیدی پر پڑی تو مسز زیدی اسے کچھ عجیب سی نظروں سے ایک ٹک گھور رہی تھی۔اجنبی مہمان سے جیسے ہی اس کی نگاہیں ٹکرائیں،ایک بار رپھر ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔اور آنکھوں سے وحشت جھانکنے لگی۔

"یہ ہمارے نئے دوست ہیں جو نیچے ٹھہرے ہوئے ہیں۔" ڈاکٹر نے ان دو اجنبیوں کا تعارف اس سے کرایا اور زلفی اس کے پاس والی نشست پر ہی آ کر بیٹھ گئی۔راشد دور ہی فیئنگ سے ٹکا کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔انگیٹھیوں کے درمیان تپائی پر شمعدان رکھا ہوا تھا۔جس میں شیشے کے پانچ فانوسوں میں موٹی موٹی مومی شمعیں روشن تھیں اور ان کی زرد روشنی انگیٹھی کے دہکتے سرخ انگاروں کے سرخ عکس کے ساتھ مدغم ہو کر ان کے آگے کی طرف جھکے ہوئے چہروں پر لرز رہی تھی۔موسم بہار کے مہمان کا چہرہ انگیٹھی کی دہکتی آگ کے عکس میں اور سرخ ہو گیا تھا۔اور مسز زیدی اپنی جگہ سمٹی ہوئی اسے خوفزدہ نظروں سے تک رہی تھی۔اس کا ذہن اب تک صاف نہ تھا۔ڈاکٹر زیدی نے ایک نظر اپنی مسز کی طرف دیکھا اور تذبذب شبہات میں ڈوبی نظروں سے اجنبی مہمان کو دیکھنے لگا۔

"آپ کو کس قسم کے کھیل پسند ہیں؟" نصرت نے اجنبی مہمان سے سوال کیا۔

"صرف زندگی کا کھیل۔" وہ خفیف سی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"جواب عجیب سا تھا۔کچھ سمجھ ہی نہ سکے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"آپ کو اس وادی کی تاریخی حیثیت سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟" ڈاکٹر نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

''مجھے اس وادی کے ایک ایک ذرے سے دلچسپی ہے۔'' وہ کھنکتی آواز میں بولا۔

''میں اس کی تاریخی حیثیت کے متعلق کہہ رہا تھا۔ کیوں کہ میرا خیال ہے کہ یہ قدیم ہندوستان پر وسطی منگولیا کی تاتا رقوم کے حملے کے دنوں کی ایک تاریخی یادگار ہے۔'' ڈاکٹر نے باقاعدہ بحث چھیڑ دی۔

''تاتاری اور قاچاری دو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔'' اجنبی مہمان بے خیالی کے عالم میں بولا۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بغیر سوچے سمجھے غیر ارادی طور پر جملے ادا کر رہا ہو۔

''تو پھر وہ شمال مغربی ہندوستان کی ہی کوئی قوم ہونگے۔'' ڈاکٹر نے دانستہ غلط بیانی سے کام لیا۔

''وہ سوادِ قازقستان کی ایک قدیم نسل سے تعلق رکھتے تھے۔'' آتشدان پر نظریں جمائے وہ اسی کھوئے ہوئے انداز میں کہتا گیا۔

''کیا یہ تہذیب اتنی ہی پرانی تھی جس قدر اجنتا اور الورا کی تہذیبیں؟'' ڈاکٹر نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں ان سے بھی پرانی۔ مگر....'' کہتے کہتے وہ چونکا۔ اور پھر ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ جس نے ان سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھنے لگے۔ اور ان کی انگلیاں آپس میں جکڑ گئی۔ اور سر پیچھے کی طرف ٹکٹکی لگائے اکڑ سا گیا۔

یہ کیفیت چند سیکنڈ تک رہی۔ وہ سب حیران تھے۔ اور جیسے اچانک ان کی نظروں کو ایک عجیب چیز دکھائی دی ہو۔ جیسے... جیسے اچانک ان کی نظروں کو ایک عجیب چیز دکھائی دی ہو۔ جیسے، جیسے وہ کرسی جس پر بیٹھا ہوا تھا، خالی ہو گئی۔ لیکن یہ کیفیت ان پر صرف چند سیکنڈ کے لیے طاری ہوئی اور اس کے بعد جب وہ اپنی نگاہوں پر یقین کرنے اور نہ کرنے کا فیصلہ ہی کر رہے تھے انھیں وہ اسی طرح اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ یہ تغیر صرف ڈاکٹر زیدی، مسز زیدی، زلفی اور

نصرت نے ہی محسوس کیا تھا۔باقی دو نئے مہمان اس طرف متوجہ نہ تھے۔وہ انگیٹھی کی آگ لوہے کی سلاخوں سے کرید رہے تھے۔مگر پھر چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھنے کے بعد ان میں سے ہر ایک کو خود اپنی نظروں پر ہی شبہ ہونے لگا۔ممکن ہے یہ ان کا وہم ہی رہا ہو۔وہ تو اسی طرح ان کے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔وہ گہری سنجیدگی جو اس پر ڈاکٹر کے سوالات کا جواب دیتے وقت طاری ہوگئی تھی،اب اس کے بشرے سے مفقود تھی۔

''اچھا،اب مجھے اجازت دیجیے۔''وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''او...ہاں...اچھا...''ڈاکٹر نے چونک کر کھوئے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔وہ اب اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی جھجک رہا تھا۔اور زلفی ڈاکٹر کی اس کیفیت کو تعجب کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں نہیں،کیوں نہیں۔لیکن آج تھک گیا ہوں۔''وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''کیا حرج ہے اگر کچھ دیر...''زلفی نے کہنا چاہا۔لیکن اس کی نگاہیں اجنبی مہمان کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں اور اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کیا کہنے جا رہی تھی۔اس کے چہرے پر ایک شدید قسم کی جذباتی کیفیت نمایاں ہوگئی۔اجنبی مہمان اپنے کمرے کے دروازے تک آچکا تھا۔وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

''مم...میرا مطلب تھا...یعنی کہ...''ہوش آنے پر وہ گھبرا گئی۔

''شاید میں آپ لوگوں کے لیے ایک دلچسپ ساتھی نہ ثابت ہوسکوں گا۔''اجنبی مہمان نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''کاش آپ جان سکتے کہ...''وہ کہتے کہتے رک گئی۔اور وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں کہہ رہی تھی کہ...''وہ پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔''کہ ہمیں بڑی

خوشی ہوگی۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہوگیا اور زلفی بھی اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آ گئی۔ یہاں ہر چیز قرینے سے صاف اور ستھری رکھی تھی اور اس صفائی میں روما کا ہاتھ تھا۔ وہی اس کے کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھی۔

کمرے میں شمعدان ایک آبنوسی میز پر رکھا ہوا تھا، جس میں تین موٹی مومی شمعیں روشن تھیں۔ وہ آہستہ چلتا ہوا میز کے دوسری طرف چلا گیا اور زلفی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوگیا۔

''کیا آپ مجھے اجازت دیں گی کہ میں لباس تبدیل کرلوں؟'' اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا اور زلفی یہ سوچتے ہی چونک پڑی کہ پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر اسے یہ علم کیسے ہوا کہ وہ بھی کمرے میں داخل ہوکر پیچھے کھڑی ہے۔ لیکن ایک اور بات دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کا دل لرز اٹھا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر پلٹ آئی۔ اس نے ایک عجیب چیز دیکھی تھی۔ وہ جب اس کی طرف پشت کر کے شمعدان کے اس طرف دیوار کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ تو کمرے کی دیوار اس کے سائے سے خالی تھی۔ اور باہر نکلتے ہی کئی خیالات ایک ساتھ اس کے دماغ میں ہلچل مچانے لگے۔ ڈیڈی اس سے اس قسم کے سوالات کیوں کر رہے تھے۔ اس سے باتیں کرتے کرتے سوچ میں کیوں پڑ جاتے تھے۔ اور.. کچھ یاد کر کے وہ سیدھی ڈاکٹر کے پاس ہی پہنچ گئی۔ مگر مسز زیدی کی کرسی خالی تھی۔

''ممی کہاں گئی، ڈیڈی؟'' اس نے ڈاکٹر سے سوال کیا۔

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

اس نے دیکھا تقریباً سب ہی سوچ میں پڑے تھے۔ سوائے ان دو اجنبیوں کے جو اخلاقاً ان کے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے چہروں پر کسی قسم کی علامتیں نہیں تھیں۔

''ڈاکٹر، یہ آدمی میرے لیے ایک معمہ ہے۔ میں اسے سمجھ نہیں سکا ہوں۔'' نصرت،

ڈاکٹر سے کہنے لگا۔

''وہ یہاں سب کے لیے ہی معمہ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔''اور...اور میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''کیا سمجھ میں نہیں آ رہا؟'' نصرت نے سرگوشی کے لہجے مین پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ میں خود نہیں جانتا کہ کیوں۔ مگر مجھے اب اس کی شکل دیکھ کر ایک خوف سا محسوس ہونے لگا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔اور پھر خاموش ہو گیا۔

''کیا آپ لوگ اور کافی پینا پسند کریں گے؟'' نصرت کو ان دونوں مہمانوں کا خیال آ گیا۔ جو یقیناً اب بوریت محسوس کرنے لگے ہوں گے۔

''اس موسم میں کافی کی ضرورت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اب کھانے کا وقت ہو چکا ہے، اجازت دیجیے۔ ہم کھانے کے بعد کھیلنے کے لیے آئیں گے۔'' ان میں سے ایک ہنس کر بولا۔اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہاں ہاں، شوق سے۔اور، راشد، تم بھی ذرا خان خلیل سے کہہ دو کیوں نہ ہم بھی کھانے سے فارغ ہو لیں۔'' ڈاکٹر نے اپنے بھانجے کو ہدایت کی، جو ابھی تک فینٹنگ سے ٹکا کھڑا ہوا تھا۔اس کا چہرہ بپھرا ہوا تھا۔اور جب اس نے زلفی کو اس اجنبی مہمان کے ساتھ اس کے کمرے میں جاتے دیکھا تو اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔زلفی لاکھ آزاد خیال سہی۔لیکن آزادی کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ کسی اجنبی کے کمرے تک قدم پہنچ جائیں۔اندر سے وہ کسی پھٹ پڑنے والے آتش دان کی طرح کھول رہا تھا۔وہ اور زلفی ایک ساتھ ہی کالج میں پڑھے تھے۔بچپن سے ان کا ساتھ تھا۔مگر کالج کی زندگی میں بھی وہ اس کی اس عادت کو پسند نہ کرتا تھا کہ وہ کالج کے دوسرے لڑکوں سے بھی اسی بے تکلفی سے ملتی تھی جس قدر بے تکلف وہ راشد سے تھی۔اور جب یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اس کی شادی راشد سے ہی ہو گی تب بھی اس نے اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ اگر اپنے لیے نہ سہی تو راشد کے لیے ہی اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی کوشش

کرے۔آج بھی وہی ہوا جس کی توقع اسے زلفی سے تھی۔وہ زلفی کو پسند ہی نہیں بلکہ اس سے محبت بھی کرتا تھا۔زلفی کو اس سے محبت تھی یا نہیں، یہ جاننا مشکل تھا۔کیوں کہ وہ اس معاملے میں کبھی زیادہ سنجیدہ نہیں دکھائی دی تھی۔ویسے اس نے اس رشتہ پر کبھی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔ اور اگر وہ اجنبی مہمان زلفی کے لیے ایک معمہ تھا تو زلفی خود راشد کے لیے ایک معمہ تھی۔

زینے سے نیچے ہال میں اتر آنے پر بھی اس کا ذہن ان خیالات سے خالی نہ ہوا اور اسی استغراق میں اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ خان خلیل خود اس کے قریب آ گیا ہے۔

''کیا کھانا لگوا دیا جائے؟'' خان خلیل نے خود ہی اسے ٹوکا۔اور وہ چونک پڑا۔

''اوہ...'' وہ بولا۔''ہاں ہاں۔یہی تو کہنے آیا تھا میں۔'' راشد نے پراگندہ ذہن کے ساتھ جواب دیا۔

''ابھی بھیجتا ہوں۔'' خان خلیل نے جواب دیا۔اور پھر باورچی خانے والے حصے کی طرف چلا گیا۔

راشد لوٹ آیا۔

اوپر ڈاکٹر، نصرت اور زلفی کو بتا رہا تھا۔''اس کا ہاتھ کتنا نرم تھا، جیسے دستانے میں ربڑ کی انگلیاں ہوں۔بڑا ملائم آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''مجھے تو ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے غائب ہو گیا ہو۔'' نصرت نے کہا۔

''ایں؟'' ڈاکٹر چونکا۔''کچھ ایسا ہی مجھے بھی محسوس ہوا تھا۔''

''دراصل ہم لوگ کسی شدید قسم کے وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے خود ہی تردید کی۔

''مگر آپ اس سے ایسے سوالات کیوں پوچھ رہے تھے؟'' زلفی نے پوچھا۔

''اوہ، بس یوں ہی۔تمہاری ممی کہہ رہی تھیں نا کہ پروفیسر پرویز سے اس کی شکل

بالکل ملتی جلتی ہے اور پرویز ہسٹری کا پروفیسر تھا۔

''اور اسی لیے آپ اس سے ہسٹری کے سوالات کر رہے تھے؟'' زلفی نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

''بھئی، میں خود نہیں جانتا کہ کیوں؟ مگر میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے ویسے ہی سوالات کروں۔''

''ڈیڈی، پچیس برس پہلے مرے ہوئے ایک آدمی کے لیے کیا آپ دوبارہ کسی پر شبہ کر رہے ہیں؟'' وہ ضبط نہ کر سکی۔

''اوہ، تو تمہاری ممی نے تمہیں بھی بتا دیا؟ خیر، یہ بات نہیں۔ بلکہ جب کبھی اس کا ذکر چھڑتا ہے، میں برداشت نہیں کر پاتا۔ آخر انسان ہوں۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا۔ ''مجھے خود بھی اس کا افسوس ہے۔''

''ڈیڈی، ایک عجیب بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔'' زلفی نے اپنا موڈ بدلتے ہوئے کہا۔

نصرت اور راشد کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ راشد بھی اپنی نشست پر آ بیٹھا تھا۔ لیکن اس کا منھ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

''کیا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اس کے کمرے میں شمعیں جل رہی ہیں۔ لیکن میں نے اس کا سایہ دیوار پر پڑتے نہیں دیکھا۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر چونکا۔

''ہاں، ڈیڈی۔ حالاں کہ پچھلی دیوار پر اس کا کافی بڑا سایہ پڑنا چاہیے تھا۔ وہ شمعدان اور دیوار کے درمیان کھڑا تھا۔''

''اور... اور اس رات کو وہ سایہ جو ہمیں نیچے نظر آیا تھا۔'' ڈاکٹر کو یاد آ گیا۔ ''میں نے

بھی اس سائے پر پڑنے والی ٹارچ کی روشنی کا دائرہ برف پر پورا پورا پڑتے دیکھا تھا۔"

وہ سب اس انکشاف سے سناٹے میں آ گئے۔

"تو کیا...؟ مگر نہیں یہ کیا بکواس ہے۔" نصرت نے کچھ کہتے کہتے اپنا خیال بدل دیا۔

"مجھے تو اس پر کچھ عجیب سا شبہ ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔

"کیسا؟" ان تینوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"ابھی نہیں، پھر بتاؤں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ لوگوں کا کھانا لگایا جا چکا ہے۔" انھیں زینے کی طرف سے روما کی آواز سنائی دی۔

"زلفی تم اپنی ممی کو لے کر آؤ۔ ہم لوگ نیچے چلتے ہیں۔" ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی اچھا۔" زلفی چلی گئی اور وہ تینوں زینے کے ذریعے نیچے اترنے لگے۔ روما ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ نصرت جب اس کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے اتنی لمبی سرد سانس کھینچی کہ راشد بھی اسے سنے بغیر نہ رہا۔ وہ نصرت کی شکل دیکھنے لگا۔ روما نے رخ دوسری طرف کر لیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ان کے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ اجنبی مہمان کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس نے دیکھا کہ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ اندر سے بند نہ تھا۔ پہلے تو وہ جھجکی مگر پھر اسے کھول کر آہستہ سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اجنبی مہمان ہی تھا، جو اس پچھلی کھڑکی میں کھڑا تھا، جو بارجے کی طرف کھلتی تھی۔ اور بارجے کے سامنے استرا خان کا برفیلا ڈھلوان پھیلتا چلا گیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت اس کی شکل اسے دھندلی دھندلی سی نظر

آرہی تھی،خدا جانے کیوں، جیسے بھیگی ہوئی پلکوں کے پردے سے کوئی چیز دیکھی جائے۔روما کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سن کر وہ پلٹ کر اسے دیکھے بغیر ہی بولا۔

''ابھی تو مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔آج آپ میری مدد کو نہ آتے تو بابا کو یہی سمجھنا پڑا کہ برفستانی بھیڑیے مجھے کھا گئے۔''

''بھیڑیے؟ ہاں۔'' وہ کھنکتی آواز میں بڑبڑایا۔''ایک بھیڑیا شورال پر بھی رہتا ہے۔ایک خونخوار بھیڑیا۔''

''جی؟'' وہ چونکی۔

''کچھ نہیں۔بیٹھنا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر وہیں سے کہا۔اور آج پہلی بار اس سے گفتگو کرنے کا اتنا موقع پا کر روما کی شریانوں میں شراب کی جیسی مستی تیرنے لگی۔ایک سرور انگیز کیفیت۔

''تمہیں معلوم ہے آج کیا ہونے والا ہے؟'' مہمان نے دبی آواز میں سوال کیا۔

''میں سمجھی نہیں؟'' روما نے پوچھا۔

''آج سے کئی سال پہلے، آج کی رات ایک طوفان آیا تھا۔'' وہ کہنے لگا۔''وہ پھر آنے والا ہے۔''

''آپ کس طوفان کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''آں....اوہ، کچھ نہیں۔بہت دنوں کی بات ہے۔شاید جب تمہارا وجود بھی نہ ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''مم...میں...میں کہنے آئی تھی۔'' وہ اس کی ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگی۔''یعنی کہ بابا...یعنی...آپ کو کچھ ضرورت تو نہیں ہے؟'' اس کی زبان نے دل کا ساتھ نہ دیا۔

''تم میرا بہت خیال رکھتی ہو، روما۔'' آج پہلی بار اجنبی نے اس کا نام لیا اور وہ خوشی

سے جھوم گئی۔اس کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا۔

''تم مجھے بہت پسند ہو۔''اجنبی مہمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور روما نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔فرط سرور سے اس کے آنسو نکل پڑے۔کتنے سالوں سے اس کے کان اجنبی کی زبان سے ان الفاظ کو سننے کے لیے ترس رہے تھے۔

''بابا کہہ رہے تھے کہ...''اس نے نظریں زمین پر گاڑ کر شرماتے ہوئے کہا۔''کہ آپ...بہت اچھے ہیں۔''

''تم لوگ بھی تو کتنے اچھے ہو۔''اسے اجنبی کا جواب ملا۔اور اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جائے اور کہے کہ''میرے سپنوں کے دیوتا،میرے خوابوں کے حسین شہزادے،تم سے اچھا تو اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔اور شاید...شاید دوسری دنیا میں بھی کوئی نہ ہوگا۔تم...تم...''لیکن اس کے خیالات کا سلسلہ اجنبی مہمان کی آواز نے منقطع کر دیا۔

''تم میرا ایک کام کر سکتی ہو؟''وہ پوچھ رہا تھا۔

روما کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ میں تو تمہارے لیے اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔ لیکن زبان سے نکلا۔''حکم دیجیے۔''

''نچلی منزل پر ایک کمرہ ہے جو کبھی کھولا نہیں جاتا۔''اجنبی نے اس کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

''وہ کمرہ؟ مگر...مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''روما کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''شاید وہ کئی سالوں سے بند پڑا ہے؟''اجنبی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔بابا اسے کھولنے نہیں دیتے۔کہتے ہیں اس کمرے میں کوئی آسیب ہے۔''روما نے بتایا۔

''کیا تم اسے میرے لیے کھول سکتی ہو،صرف میرے لیے؟''

''مگر بابا؟''

''کیا اتنا بھی نہیں کر سکو گی میرے لیے؟''

''کروں گی۔آپ کی خوشی کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔کیوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔اور یہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔''اجنبی مہمان نے خود ہی اس کے دل کی بات کہہ دی۔وہ بات جو مدت سے روما کے سینے میں گھٹ رہی تھی۔جسے لبوں تک لانے کی جرأت آج تک وہ نہ کر سکی تھی۔مگر اسے اس احساس سے دوہری خوشی ہوئی کہ اس کا محبوب اس کے دل کی کیفیت سے ناواقف نہ تھا۔

''میں گیارہ بجے آپ کو لے چلوں گی اس کمرے میں۔اس وقت تک نوکر بھی چلے جاتے ہیں۔''روما نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

''میں جانتا تھا کہ تم میری بات نہیں ٹالو گی۔''وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا اور روما شرما کر رہ گئی۔اس کے منہ سے الفاظ نہ نکل سکے۔

''تو پھر آج رات کو گیارہ بجے۔''اجنبی نے دوہرایا۔

''کیا آپ نیچے آجائیں گے؟ ہمارے شہری مہمان برآمدے میں لومڑیوں کی طرح تاک لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔''روما نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں آؤں گا۔''وہ بولا۔

روما چاہتی تھی کہ وہ اس سے کچھ اور باتیں کرے۔کچھ ایسی باتیں جنھیں سننے کے لیے اس کے کان ترس گئے ہیں۔اگر وہ اسے اپنی چوڑی مضبوط بانہوں میں بھر کر دبا نہیں سکتا، اگر وہ اسے کم از کم ایک بار اپنے چوڑے سینے سے لگا لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تو، کچھ باتیں ہی کرے، پیار کی، محبت کی۔کئی سالوں کے انتظار کے بعد اگر آج اسے اس کے خوبصورت سبک ہونٹوں کا ایک بوسہ بھی مل جاتا تو اس کے جذبات کو کچھ تو تسکین ہو جاتی۔مگر پھر اسے یاد آگیا کہ خان خلیل نے ایک وعدہ کیا ہے۔اور باپ کا وعدہ بیٹی سے غلط نہیں ہو سکتا۔اس کے علاوہ

بھی وہ رات کو گیارہ بجے پھر اس سے مل رہی ہے۔رات کے گیارہ بجے، جب کہ کاشانے میں سناٹا ہوگا اور صرف الوؤں کی خاصیت رکھنے والے وہ شہری مہمان ہی جاگتے ہوں گے، جنھیں خواہ مخواہ دوسروں کی کھوج لگی رہتی ہے۔لیکن وہ اپنے برآمدے میں ہی ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆

وہ دس بجے تک برآمدے میں بیٹھے رہے۔ڈاکٹر اور نصرت شطرنج کھیلنے لگے تھے اور باقی لوگ تاش میں مشغول تھے۔مسز زیدی کی طبیعت ابھی تک بحال نہیں ہوئی تھی۔وہ اس واقعے کے بعد سے ہر وقت کھوئی کھوئی سی اور پریشان نظر آتی تھیں۔اور ڈاکٹر نے یہ سمجھ کر کہ ایک وہم ہی تو ہے، خود بخود ٹھیک ہو جائے گی، کوئی زیادہ توجہ نہ دی تھی۔زلفی ماں کے ہی کمرے میں تھی اور بیٹری سسٹم ریڈیو پر ایک آرکسٹرا کی دھن سن رہی تھی۔

آج کی رات خلاف معمول زیادہ اندھیری اور طوفانی تھی۔ہوائیں چاروں سمت بھٹک کر شور مچاتی پھر رہی تھیں۔استرا خان کے بھیڑیے بھی آج نہ جانے کیوں خاموش تھے۔شاید وہ بھی کہیں دبک کر پڑے ہوں گے۔نیچے ہال میں کچھ شہری مہمان جو مغرب پسند سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے، رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر ایک رقص کے دھن کے ریکارڈ پر بال ناچ کر اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔کیوں کہ ہال میں، یا علی الاعلان کاشانے میں، کسی قسم کی شراب پینے کی اجازت نہ تھی۔لوگ ایسا کر سکتے تھے، مگر اپنے کمروں میں جا کر۔اور نشے کی حالت میں انھیں باہر نکلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔یہ اخلاقی پابندیاں تھیں، جنھیں بہر حال مہذب لوگ ایک طرح کا دستور سمجھ کر ہی ان کا احترام کرتے تھے۔صرف ڈاکٹر کا گروپ ہی کچھ خبطی، یا پھر زندہ دل مشہور تھا۔کیوں کہ وہ لوگ اس موسم میں بھی دیر سے سوتے تھے اور ان کی تفریحات بھی عجیب تھیں۔یا تو وہ فضول سی باتوں پر آپس میں بحث کرتے نظر آتے یا پھر تاش اور شطرنج جیسے کھیلوں میں کھوئے رہتے۔

Akram Allahabadi

بہر حال وہ اس موسم سے پورا پورا لطف لیتے تھے۔اور اگر برف باری مسلسل نہ ہو رہی ہوتی تو وہ اسکیٹنگ اور اسکائنگ کے بھی بڑے شوقین تھے۔

مگر آج وہ دس بجے ہی اٹھ گئے تھے۔ایک تو سردی کی شدت جسم کو گلائے ڈال رہی تھی دوسرے،کل کے واقعات کے بعد ان کا دل بھی آج نہ لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر سے اپنی بیوی کی پریشانی نہ دیکھی گئی اور وہ پوچھ ہی بیٹھا۔''آخر ایسی کیا پریشانی لاحق ہو گئی ہے تمہیں جو یہ حال بنا رکھا ہے؟''

''آپ مانیں یا نہ مانیں مگر وہ...وہی ہے۔''مسز زیدی بڑبڑائیں۔

''وہ کون؟''

''پرویز۔''

''حالاں کہ اس نے اپنا نام بھی شہاب بتایا تھا اور خان خلیل کے کہنے کے مطابق ہوٹل کے رجسٹر میں بھی اس کا یہی نام تھا۔''

''یہی تو کہہ رہی ہوں۔پرویز کا پورا نام شہاب پرویز تھا۔شہاب اصل نام اور پرویز شاید تخلص۔''

''اچھا تھا بھی تو کیا ہوا؟''

''آپ میری بات سنے بغیر ناراض ہونے لگتے ہیں۔میں کیا بتاؤں؟''مسز زیدی نے اداس لہجے میں کہا۔

''نہیں،اب میں ناراض نہیں ہوں گا۔مجھے واقعی افسوس ہے کہ میں بعض اوقات ایسی بے تکی باتیں کیوں کر جاتا ہوں۔مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے۔''ڈاکٹر کے لہجے میں صداقت اور اعتراف کی جھلک تھی۔

''آپ...آپ....''مسز زیدی گلوگیر ہو گئیں۔''شاید آپ نہیں جانتے کہ مجھے آپ کی بدگمانیوں سے کتنی روحانی اذیت ہوتی ہے۔میں آپ کی بیوی ہوں۔میں آپ سے محبت

کرتی ہوں۔ بلکہ... بلکہ مجھے آپ سے عشق ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر کے کالر میں منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔ یہ مکالمے اندر داخل ہوتی ہوئی زلفی نے بھی سن لیے تھے۔ وہ ذرا دیر پہلے ریڈیو بند کر کے باہر چلی گئی تھی۔ اور اس وقت اچانک آ پہنچی تھی۔ پہلے تو اسے اس بوڑھے معاشقے پر ہنسی آئی۔ مگر پھر وہ ماں کو روتے دیکھ کر سنجیدہ ہوگئی۔ اس نے سنا تھا کہ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ اور آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں بھی جانتا ہوں۔ میں بھی جانتا ہوں۔ مگر انسان ہی تو ہوں۔ اور پھر ہماری لڑائی بھی کوئی لڑائی ہے۔'' ڈاکٹر یہ کہہ کر اس کا سر سہلانے لگا۔ اور پھر اپنے رومال سے اس کے آنسو بھی پونچھ ڈالے۔

''ہم لوگ اگر سٹھیائے نہیں تو اب سٹھیا جائیں گے۔'' وہ خود ہی چونک کر بولا۔ ''بات تو پرویز کی ہو رہی تھی نا؟ کیا کہہ رہی تھیں تم؟'' ڈاکٹر یاد کرنے لگا۔ زلفی آرام کرسی پر جا بیٹھی تھی۔

''میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ پرویز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی کہوں گی کہ اس نے میرے سامنے ہی دم توڑا تھا۔ بخدا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آپ نے بھی تو اخباروں میں پڑھا تھا۔''

''تو کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ پرویز دوبارہ زندہ ہو گیا ہے؟'' ڈاکٹر کے اس جملے پر زلفی کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ وہ انکی باتیں کان لگا کر سننے لگی۔

''زلفی کہہ رہی تھی کہ اس نے اس کا سایہ دیوار پر نہیں دیکھا۔ آپ کہہ رہے تھے کہ مصافحے کے وقت اس کے دستانے اتنے نرم تھے جیسے اندر روئی بھری ہو۔ اور پھر اس رات وہ چیخیں اور اس کا باہر جانا۔ میں کہتی ہوں یہ ضرور کوئی بھیانک بات ہے۔''

''یعنی... یعنی تم کہتی ہو وہ زندہ آدمی نہیں ہے؟'' ڈاکٹر کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے، ممی؟ کیا ہم اپنے ساتھ اسے چلتے پھرتے نہیں دیکھتے؟'' زلفی

بھی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ فریب نظر ہو یا محض ہیولیٰ۔''

''بھئی، تمہاری باتیں تو مجھے بھی ڈرائے دے رہی ہیں۔'' ڈاکٹر کہنے لگا۔

''پرویز کے ایک کان کی لو ذرا سی کٹی ہوئی تھی۔ اور کل میں نے خود دیکھا کہ اس کے ایک کان کی بھی لو۔۔''

''بس کرو، بیگم۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔''

''ڈیڈی، ایک ہم ہی تو نہیں ہیں یہاں قیام کرنے والوں میں۔ اور لوگ بھی تو ہیں آخر۔'' زلفی نے اس کے خیال کی تردید کی۔

''تم نہیں سمجھو گی، بیٹی۔ یہ کوئی بڑی بھیانک بات ہے۔ بیس پچیس برس پہلے مرا ہوا ایک آدمی ہمیں پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ اوخدا، یہ ہے کیا راز؟'' وہ سر کر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''میں نہیں مانتی، ڈیڈی۔ میں آپ لوگوں کے اس وہم کو جھوٹا کر دکھاؤں گی۔''

''نہیں، بیٹی، یہ وہم نہیں ہے۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ کیا تمہیں تمہارے دادا پھوپھا کا وہ واقعہ یاد نہیں ہے کہ جس صبح کو وہ ریلوے ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوئے تھے، اسی شام کو اپنے گھر پہنچ کر اپنے بیوی بچوں سے ملے تھے اور ان کے دوبارہ چلے جانے کے بعد ہی ریلوے سے تار آیا تھا کہ وہ صبح کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بیٹی کو سمجھایا اور اس مثال کو سن کر وہ خود بھی سناٹے میں آ گئی۔ واقعی یہ واقعہ صحیح تھا۔ اس کے اپنے سامنے کا واقعہ تھا۔

''اس وقت آرام کرو۔ کل ہم کسی اور ہوٹل میں اپنے لیے جگہ تلاش کریں گے۔'' ڈاکٹر نے لباس تبدیل کرنے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔

خدا جانے کیوں اب زلفی کو بھی اس اجنبی کے خیال سے بری طرح خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے دیکھا کمرے کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اور وہ ایک نامعلوم دہشت کے زیر اثر

اسے بند کرنے اٹھ کھڑی ہوئی۔مگر دروازے تک پہنچتے ہی اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔وہ اجنبی مہمان اپنے کمرے سے نکل کر سامنے سے گزر رہا تھا۔زلفی نے گھبرا کر زور سے دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیے۔

''کون ہے، زلفی؟''مسز زیدی نے پوچھا۔

''وہ...وہی...وہی جا رہا ہے سامنے۔''وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''خُ...خُ...خدا جانے کیوں وہ یہاں آیا ہے؟ کک...کیوں ہمارے پاس کے کمرے میں موجود ہے؟''مسز زیدی حلق میں پھنسی آواز سے بڑبڑائیں۔

''مگر خلیل تو کہہ رہا تھا کہ وہ ہر سال اس موسم میں یہاں آتا ہے۔''زلفی نے کہا۔

''مگر کک...کیوں؟'' آواز پھر ان کے حلق میں پھنس گئی۔اور زلفی خود بھی اس کیوں کا جواب نہ دے سکی۔وہ صرف سوچ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اسے جھرجھریاں بھی آ رہی تھیں۔

''ارے ممی، کہیں وہ قصہ...''وہ ایک دم چونک کر بولی۔لیکن اس نے دیکھا مسز زیدی نے لحاف تان لیا تھا۔ڈاکٹر شب خوابی کا لباس تبدیل کرنے گیا ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

نیچے ہال میں اس وقت سناٹا تھا۔مگر کیاؤنٹر کے پاس ہی موم بتی شمع کی مدھم روشنی میں روما بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔شمع کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ بڑا معصوم اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کے نیچے اس کی بڑی بڑی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔اجنبی مہمان کو دیکھتے ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ایک ہاتھ سے شمع اٹھا کر اس نے چھوٹے سے رومال سے ہمیشہ بند رہنے والے کمرے کی وہ چابی نکالی جو وہ اپنے باپ کی الماری سے چرا کر لائی تھی۔اور آگے آگے ہو لی۔اجنبی مہمان پیچھے چلتا رہا۔

ایک راہداری سے گزر کر وہ اس حصے میں آ گئے جہاں ایک قطار سے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ان میں سے ایک میں تو پرانا سامان بھرا تھا اور دوسرے میں عمارتی لکڑیاں جو کسی خاص ضرورت کے لیے ہی رکھی گئی ہوں گی۔تیسرا کمرہ وہ تھا جس پر ایک زنگ آلود قفل لٹک رہا تھا۔ لیکن اسے کھولنے میں زیادہ وقت نہیں پیش آئی۔البتہ اندر داخل ہونے میں کمرے کی سیلی ہوا نے پہلے تو اسے ناک بند کر لینے پر مجبور کر دیا مگر پھر تازہ ہوا کے داخل ہونے سے وہ بدبو کم ہو گئی۔کمرے میں کسی اوسط مذاق کی آرائش کا سامان موجود تھا۔مگر سب گرد سے اٹا ہوا۔ویسے ہر چیز اپنی جگہ باقاعدگی سے رکھی ہوئی تھی اور بیچ میں دیوار سے لگی ہوئی ایک آبنوسی سنگار میز جس میں ایک بڑا گول آئینہ رکھا تھا، یہ ظاہر کر رہی تھی کہ کمرہ زنانہ تھا۔کمرے کی دیواریں بھی گرد آلود تھیں اور ان پر کچھ تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں جن کے شیشے گرد سے ڈھک گئے تھے۔نہ جانے کیوں اس کمرے میں روما کا دل گھبرانے لگا۔اسے ایک عجیب سی دہشت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے برخلاف اجنبی مہمان کمرے کی ہر چیز کو گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔پھر وہ دیوار کی طرف بڑھا اور اس پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔اس نے اپنی آستین سے اس کے شیشے کو رگڑ کر صاف کر دیا۔پھر اس کی نظریں اس تصویر پر جم گئیں۔روما شمع اور قریب لے آئی۔لیکن اس تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ بھی چونک سی پڑی۔یہ ایک بہت خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔اتنی خوبصورت کہ روما کا اپنا حسن اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔تصویر کچھ اس انداز سے کھینچی گئی تھی جیسے دیکھنے والے سے بول ہی پڑنا چاہتی ہو۔اور وہ اجنبی مہمان اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

''بیس سال۔''وہ ایک لمبی سرد سانس کھینچ کر بولا۔روما کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہوا کے کے جھونکے سے کسی جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی ہو۔

''صرف ایک دن۔کل اسے بیس سال پورے ہو جائیں گے۔''سرگوشی کے لہجے میں وہ بڑبڑا رہا تھا۔لیکن اس کی آواز روما کو اتنی صاف سنائی دے رہی تھی، جیسے وہ اس کے کان

میں ہی بول رہا ہو۔

''جانتی ہو کون ہے یہ؟'' اس نے روما کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''اونہونہہ۔'' روما کے لبوں سے خفیف سی آواز نکلی۔

''میں بیس سال سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ بیس سال، جو کل پورے ہو جائیں گے۔ کل اسے واپس جانا ہوگا۔''

''لیکن یہ ہے کون؟'' روما نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہ وہ ہے جو مجھ سے پہلے چلی گئی تھی اور... اس تھوڑی دیر کے فرق کے لیے مجھے بیس سال تک اس کے لیے بھٹکنا پڑا ہے۔ تا کہ پھر ایک بار وہ اسی عمر کو پہنچ جائے۔ وہ دن جو اب سے پچیس سال پہلے آیا تھا اور کل پھر آ رہا ہے۔ وہ مجھے تلاش کر رہی تھی اور میں اسے۔ اور بالآخر مایوس ہو کر اس نے اسی جگہ اسی ماحول میں پھر ایک بار نئے سرے سے زندگی شروع کی اور اب ہماری جدائی کی مدت پوری ہو رہی ہے۔ کل پھر وہ بیس سال کی ہو جائے گی۔ وہی دن۔ وہی عمر۔ وہی مقام۔ وہی ماحول۔''

''یہ آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں؟'' روما نے گھبرا کر سوال کیا۔ ''یہ تصویر کس کی ہے؟''

مگر اجنبی مہمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس تصویر کے سامنے سے ہٹ کر اس گدے دار پلنگ کی طرف آیا جس پر گرد جمنے کے علاوہ جس کے گدے کو بھی کیڑے کھا گئے تھے۔ اس نے جھک کر اس پلنگ کو چوم لیا۔

''وہ اس پر لیٹا کرتی تھی۔''

پھر اس نے اس گدے کے ایک سرے پر پڑے ہوئے تکیے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

''اس کی ملائم ریشمیں زلفیں اس پر بکھرتی تھیں۔''

روما حیرت زدہ نظروں سے اس کی یہ حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ تصویر کو دیکھ کر بڑبڑایا۔

Akram Allahabadi

''میں نے دیر کرنے کی کافی سزا بھگت لی ہے، کافی ۔تمہیں کھو کر مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملا، کہیں بھی نہیں ۔کاش یہ ایک دن پڑ لگا کر اڑ جائے ۔کوئی نہیں جانتا کہ میں کتنا بے چین ہوں ۔اس وقت کے لیے جب میں تمہیں دوبارہ پالوں گا۔ ہمیشہ کے لیے ۔ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے تصویر کو چوما اور پیچھے ہٹ آیا ۔پھر وہ کمرے کی ہر چیز پر ایک الوداعی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل آیا۔

نہ جانے کیوں اس وقت اس اجنبی مہمان کی یہ حرکتیں روما کو اچھی نہیں لگیں ۔اس کا دماغ اس تصویر میں الجھا ہوا تھا ۔وہ سوچ رہی تھی اس مہمان کا اس تصویر سے کیا تعلق؟ بابا کیوں اس کمرے کو ہمیشہ بند رکھتے ہیں؟ وہ بیس سال اور آخری دن جیسے الفاظ کیوں ادا کر رہا تھا؟ اور پھر اسے یاد آیا کہ اس نے اس پلنگ کو، اس تکیے کو، اس تصویر کو چوما بھی تھا ۔ایک مایوس کن احساس اسکے دل کو مسلنے لگا ۔تو کیا وہ کسی اور سے پیار کرتا ہے ۔اس انجانی لڑکی سے، جس کی تصویر اس کمرے میں موجود ہے ۔کیا اتنے برسوں سے وہ جس کے لیے تڑپتی رہی ہے، جس کے انتظار میں وہ برف باری کے آغاز سے ہی گھنٹوں روز شام کو جھجے پر کھڑی راہ تکا کرتی تھی، وہ اس کا نہیں ہے ۔وہ آگے آگے چل رہا تھا اور کمرہ مقفل کرنے کے بعد وہ ان ہی خیالات میں مستغرق اس کے پیچھے آرہی تھی ۔پھر اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کب اوپر چلا گیا ۔وہ تو اس وقت چونکی جب اسے اپنے سامنے خان خلیل کھڑا نظر آیا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا، روما۔ میں نے خان نواز سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کمرہ کبھی نہ کھولا جائے گا ۔تم نے پچیس برس تک نبھائے ہوئے وعدے کو آج خاک میں ملا دیا۔'' وہ نرم اور آہستہ لہجے میں بولا۔

''بابا، انھوں نے میری عزت، میری جان بچائی تھی ۔کیا میں ان کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہ کرتی۔''

''خیر، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے ۔اس پر افسوس کرنے سے فائدہ؟ البتہ یہ راز اب بھی

راز رہنا چاہیے ورنہ خان نواز میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔"

"کیوں؟ اس میں ایسی کیا بات ہے؟"

"وہ خان نواز کی بیٹی شاہینہ کا وہ کمرہ ہے جس میں پچیس سال پہلے وہ رہا کرتی تھی۔"

"وہ، جسے بھیڑیے کھا گئے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں۔ہاں، یوں ہی سمجھ لو۔" خان نواز سر ہلا کر پلٹتے ہوئے بولا۔

"سمجھ لوں؟ کیوں؟ کیا کوئی اور بات تھی؟ بتایئے نا، بابا۔"

"خان نواز نے اسے اپنے ہاتھوں سے استرا خان پر قتل کر ڈالا تھا۔ وہ ایک پردیسی مہمان سے محبت کرتی تھی۔"

"اف! تو وہ تصویر اسی کی ہے کمرے میں؟"

"ہاں، اسی بدنصیب کی ہے۔"

"اور وہ پردیسی مہمان؟"

"وہ بھی شاید زخمی ہو کر ندی میں گر کر مر گیا تھا۔"

"ندی میں گر کر مر گیا تھا؟" روما نے حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے زینے کے اندھیرے میں گھورتے ہوئے دوہرایا۔ "بابا، کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"نہیں، اسے قوزی نے دیکھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے خان نواز کو بیٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے دیکھا تھا اور اسی لیے خان نواز نے اسے اندھا کر دیا تھا۔"

اس ذکر پر روما سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔ پھر اس نے اوپری منزل کی طرف دیکھا اور اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"بابا، ہمارا مہمان اس تصویر سے عجیب عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں بتایا۔

Akram Allahabadi

"کیسی باتیں؟" خان خلیل چونکا۔ جس پر رومانے اسے تمام باتیں بتا ڈالیں اور خان خلیل تصویر حیرت بنا سنتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

دہشت ناک منظر

تاریک برفیلی رات کے بھیانک سناٹے کو چیرتی ہوئی چیخ کی آواز سنتے ہی مسز زیدی کا کلیجہ کانپنے لگا۔اور ڈاکٹر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

''ڈیڈی، وہ چیخ؟'' زلفی لحاف سے سر نکال کر بولی۔

''ہاں، سن رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے بستر سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔وہ کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

''خدا کے لیے یہ کھڑکی بند کر دیجیے۔مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''چیخ کی آواز عقبی ڈھلوان کی طرف سے آ رہی ہے اور تم یہاں کانپتی جا رہی ہو۔''

''ڈیڈی، وہ...پھر سنائی دی۔'' زلفی پھر بولی۔

''تو میں کیا کروں؟ تم بھی چیخنے لگو۔'' ڈاکٹر نے اسے ڈانٹ دیا اور وہ چپ رہ گئی۔ لیکن وہی نہیں، آج کاشانے میں ان بھیانک چیخوں کو سننے کے لیے اور بھی لوگ جاگ رہے تھے۔نصرت اور راشد، جن کے ارادے آج اچھے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ان کے علاوہ خان خلیل اور اس کی بیٹی روما۔جن کے دل ایک عجیب اور بھیانک تصور کی تصدیق کے لیے بے چین تھے۔کیوں کہ خان خلیل بیٹی سے اس کا ہاتھ اجنبی مہمان کے ہاتھ میں دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔اور روما خود اس پردیسی کو مدت سے دل میں بسائے بیٹھی تھی۔وہ جاننا چاہتے تھے کہ اس نے اس بند کمرے میں موجود خان نواز کی لڑکی شاہینہ کی تصویر سے اتنی گہری دلچسپی کیوں لی تھی۔ خان خلیل کو یہ بھی معلوم تھا کہ شاہینہ اس وقت بیس برس کی ہی تھی جب وہ المناک واقعہ پیش آیا تھا۔اور اب اس واقعے کو بھی تقریباً پچیس ہی سال گزر چکے تھے۔مگر اب کس کے بیس سال پورے ہونے والے تھے؟ وہ کیوں ایسا کہہ رہا تھا؟ اسے استرا خان کی اس بھیانک خونی

داستان سے کیا واسطہ؟ دونوں باپ بیٹی یہی سوچ رہے تھے۔

اور اوپر ڈاکٹر والے کمرے سے ملحق کمرے میں شدت جذبات سے پاگل، راشد اور اندر ہی اندر روما کے حصول کی تمنا میں سلگنے والا نصرت، ایک خطرناک فیصلہ کر چکے تھے۔ ایک مہذب سوسائٹی کے افراد ہونے کے باوجود ان میں وہ فطری جنگلی پن موجود تھا جو جذبات کے ہاتھوں انسانوں کو کبھی کبھی اتنا خودغرض بنا دیتا ہے کہ وہ تہذیب، اخلاق اور انسانیت سے گری ہوئی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔ راشد اس لیے سلگ رہا تھا کہ زلفی نے اس اجنبی مہمان کی خاطر اس سے آنکھیں پھیر لی تھیں اور نصرت یہ جانتا تھا کہ اس اجنبی کے ہوتے ہوئے روما کبھی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکے گی۔ استرا خان پر آدم خور خونی بھیڑیوں کے انسانوں کو چیر پھاڑ کر کھا ڈالنے کے قصوں نے ان کے دماغوں میں ایک خطرناک سازش کو جنم دیا تھا۔ بالکل ویسی ہی جیسی آج آج سے پچیس سال پہلے اسی ویران استرا خان پر خان نواز نے اپنی بیٹی کے لیے کی تھی۔

وہی بھیانک چیخ پھر ایک بار استرا خان کے مشرقی ڈھلوان سے سنائی دی اور فضا میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ ڈاکٹر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے ٹارچ سرہانے سے نکالی اور برآمدے میں نکل آیا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ زلفی بھی اٹھ کر آ گئی۔

''یہ چیخیں آخر کہاں سے سنائی دیتی ہیں؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''زندگی میں ایسے واقعات میں نے پہلے کبھی دیکھے سنے نہیں۔'' مگر ابھی یہ جملہ اس کے لبوں سے ادا ہوا ہی تھا کہ پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی وہی چیخ۔ اور اب کی بار وہ اتنی بھیانک تھی کہ زلفی کا کلیجہ کانپ گیا۔

''چلیے نا، ڈیڈی۔ نہ جانے کیا چیز ہے؟'' وہ ڈاکٹر کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

''کوئی یہاں آ رہا ہے کیا؟''

''لیکن وہ کاشانے کے آس پاس ہی کیوں بھٹکتی پھرتی ہے؟''

''ٹھہرو، وہ دیکھو۔'' ڈاکٹر نے ٹارچ سے ڈھلوان پر پھر روشنی ڈالی۔ محض ایک سفید سا سایہ، جو ٹارچ کی روشنی میں ایک بار نظر آیا اور پھر کہر کی چادر نے اسے ڈھک لیا۔

''میں اس واقعے پر ضرور ایک کتاب لکھوں گا، زلفی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''اگر وہ اسی لڑکی کی بھٹکتی روح ہے، ڈیڈی، تو خدا کے لیے ایسی چیزوں سے دلچسپی نہ لیجیے۔''

مگر اسی وقت پھر استرا خان کی بلندیوں سے انھیں ہواؤں کی سنسناتی ہوئی گونج کے ساتھ وہی انجانی آواز سنائی دی۔ ''آ....جا...ؤ ....'' جیسے کوئی کسی کو بلا رہا ہو۔ وہ اسے صاف سن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آواز ہوا کے دوش پر بہتی پھر رہی ہو۔ ''آ...جا...ؤ...''

''اجنبی مہمان کے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور زلفی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ ڈاکٹر سے لپٹ گئی۔ اجنبی مہمان اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ وہ خوف زدہ آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی ڈاکٹر کو گھسیٹتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ مگر اجنبی مہمان نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ ان کے سامنے سے گزرتا ہوا زینے کی طرف چلا گیا۔ اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ زینے تک جاتے جاتے جیسے زینے پر پھیلی ہوئی تاریکی میں مدغم ہو گیا ہو۔

''ڈیڈی، چلیے نا کمرے میں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ زبردستی ڈاکٹر کو اس کی آستین تھام کر گھسیٹنے لگی۔ اور ڈاکٹر کو جانا ہی پڑا۔ زلفی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا دروازہ اندر سے جکڑ کر بند کر لیا۔ مسز زیدی لحاف میں منہ ڈھانپے کانپ رہی تھیں۔

ان کے اپنے کمرے میں آجانے کے فوراً بعد ہی پاس والے کمرے کا دروازہ کھلا اور لبادے پہنے ہوئے نصرت اور راشد باہر نکلے۔ انھوں نے دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں، جو وہ لبادے میں چھپائے ہوئے تھے۔ ایک نظر ادھر ادھر دیکھ کر وہ تاریک زینے میں اتر گئے۔

Akram Allahabadi

مگر شاید انھیں معلوم نہ تھا کہ دو آنکھیں اور بھی انھیں دیکھ رہی ہیں۔ روما کو ویسے بھی ذہنی الجھن کی وجہ سے آج رات نیند آنا مشکل تھی۔ اس نے جب اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس اجنبی کو ہال میں نمودار ہو کر شمع کی روشنی سے دور اندھیرے میں مدغم ہوتے دیکھا تو چونک پڑی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ مگر پھر فوراً ہی کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر وہیں رک گئی۔ اس نے کچھ دیر بعد زینے سے ان دونوں کو اترتے دیکھا۔ رائفلوں کی نالیں ان کے لبادوں سے جھانک رہی تھیں۔ وہ کسی خیال سے کانپ اٹھی۔ اجنبی کے پیچھے وہ دونوں بھی ہال سے نکل گئے۔ مگر باہر لوہے کی مضبوط سلاخوں والا دروازہ تو بند تھا۔

روما دونوں ہاتھوں سے باپ کے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگی۔ خان خلیل گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اور جب روما نے اسے بتایا کہ اجنبی مہمان کی جان خطرے میں معلوم ہوتی ہے اور وہ دونوں رائفلیں لے کر اس کے پیچھے گئے ہیں، تو وہ فوراً ہی لبادہ پہن کر تیار ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے نوکر نورو کو اٹھایا اور صندوق سے اپنی پرانی بندوق نکال کر کاندھے پر لٹکا لی۔ ایک اور چھوٹی بندوق اس نے نوکر کو دینی چاہی، مگر روما نے اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''میں بھی ساتھ چلوں گی، بابا۔ میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گی۔''

''مگر، بیٹی، استرا خان پر خونی بھیڑیے...'' خان خلیل نے سمجھانا چاہا۔

''جو باپ کا حشر ہوگا، وہی بیٹی کا ہوگا۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میں اکیلی جی کر کیا کروں گی، بابا؟'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''ایسا نہیں کہتے، میری بچی۔ ایسا نہیں کہتے۔'' شدت جذبات سے خان خلیل کے بھی آنسو نکل پڑے۔ اس نے بیٹی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ نورو نے الماری سے دو بیٹریاں نکال لیں اور وہ چل پڑے۔ باہر نکل کر انھوں نے دیکھا، ان دونوں میں سے ایک باہر پہنچ چکا تھا اور دوسرا لوہے کی سلاخوں والے پھاٹک پر چڑھ کر باہر کود رہا تھا۔ روما نے بندوق سیدھی کی مگر خان خلیل نے بندوق پر ہاتھ ڈال دیا۔

Akram Allahabadi

''ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے، بیٹی۔''

نورو نے جلدی سے پھاٹک کھول دیا اور وہ باہر آ گئے۔ انھوں نے دیکھا دور ڈھلوان سے اوپر کی طرف کہر کی چادر میں شہری مہمان کی نارچوں کی روشنی کسی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اور پھر انھیں وہ اجنبی مہمان نظر آ گیا۔ وہ کبھی کہر کی چادر میں چھپ جاتا اور کبھی نظر آنے لگتا۔ استرا خان کی بلندیوں سے اب بھی۔ وہ گونجتی ہوئی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ ''آ....جا...ؤ...''

نصرت اور راشد کے قدم اور تیز ہو گئے۔ وہ سپاٹ جوتے پہنے ہوئے تھے۔ برف باری جاری تھی۔ لیکن لمبی نارچوں کی طاقتور روشنی ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔ ڈھوان اور استرا خان کا یہ سامنے کا حصہ برف میں دبی جھاڑیوں کے جھنڈ سے صاف تھا۔ اس لیے وہ آزادی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر اچانک ان سب کی نگاہیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں۔ سفید برف کے انعکاس سے پہاڑی پر بہت ہلکی سفید روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اب کی بار وہ آواز انھیں سامنے اوپر کی چوٹی کی طرف سے سنائی دی تھی۔ ان کی نارچیں بلند ہو گئیں۔ اور انھوں نے جو کچھ دیکھا وہ انھیں خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ انھیں اجنبی مہمان نظر آیا۔ وہ چوٹی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ کبھی کہر میں چھپتا کبھی نظر آتا۔ اور پھر انھوں نے اس پراسرار وجود کو دیکھا، جس کی بھیانک چیخیں، استرا خان کے ہر گوشے سے سنائی دیا کرتی تھیں۔ وہ دوڑتی آ رہی تھی۔ ایسی جیسے اس کے پر لگے ہوں۔ اور پھر کہر کی دھند میں وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ نصرت اور راشد کی رائفلیں جھک گئیں۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ استرا خان پر بھٹکنے والی اس روح کو جس کی داستان اس رات اندھے قوزی نے بیان کیا تھی، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ اس اجنبی مہمان سے گلے مل رہی تھی۔ تو پھر کون تھا وہ؟ روما، خلیل اور نورو عقب میں دوسری سمت سے چڑھے تھے۔ انھیں اجنبی مہمان اور اس سفید سے وجود کی صرف ایک جھلک نظر آ سکی، جو دور سے ہی کہر میں مدغم ہو گئی۔ مگر وہ برابر اوپر کی طرف چڑھے چلے جا رہے تھے۔ خان خلیل

ایسے راستے سے اوپر چڑھ رہا تھا جہاں خونی بھیڑیوں کا امکان کم تھا۔ مگر کہر کی دھند میں انھیں یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں سے کہاں آ پہنچے ہیں۔ ادھر نصرت اور راشد بھی کہر میں راستہ بھٹک گئے تھے۔

اچانک کسی سرگوشی کی آواز نے ان تینوں کو چونکا دیا۔ روما تارچ روشن کرنا چاہتی تھی، مگر خان خلیل نے اسے روک دیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہر میں آگے بڑھتے گئے۔ لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ بھٹکتے ہوئے استرا خان کی اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جہاں سے لاجوردندی کی طرف ڈھلوان شروع ہوتا تھا۔ انھیں اس چوٹی پر دو سائے نظر آئے جو کہر میں دھندلے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

''آج کا ایک دن مجھ پر ہزاروں سالوں سے بھی گراں گزر رہا ہے، شاہینہ۔ کیا تم آج ہی میرے ساتھ نہیں چل سکتیں؟ کتنی مدت سے بے سکون ہوں میں۔'' آواز روما کو پہچانی معلوم ہوئی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''پانچ سال تک تمہاری تلاش میں بھٹکنے کے بعد مجھے دوبارہ زندگی کی بھیک مانگنی پڑی تھی۔ میں جانتی تھی کہ کبھی نہ کبھی تم کو میری یاد یہاں ضرور کھینچ لائے گی۔ اور تم آ گئے۔ مگر مجھے اس زندگی کے اتنے ہی دن پورے کرنے پڑیں گے، جتنے دن میری پچھلی زندگی نے پورے کیے تھے۔ میں نے اتنے ہی دن مانگے تھے۔''

''تو یہ مقدر ہے؟''

''ہاں۔ اور اس سے پہلے ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔''

''خیر، میں یہ دن بھی گزار لوں گا کسی طرح۔ لیکن اس بستی کے لوگ میرے ہیولے کو میرا وجود سمجھنے لگے ہیں۔ شاید ان کے درمیان کل تک میرا ٹھہرنا بھی مشکل ہو جائے۔''

''میں کل اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گی۔ اور پھر استرا خان کے بھیڑیے کبھی ہماری آواز نہ سن سکیں گے۔ کل ہمارا سفر یہیں سے شروع ہوگا اپنی منزل کی طرف، کل۔'' یہ کہہ کر اس

سائے نے جو اجنبی مہمان کو ہیولا تھا، ایک لمبی سانس کھینچی اور خان خلیل اور روما کو ایسا معلوم ہوا جیسے برفستانی ہوا نے کوئی سسکی بھری ہو۔ آج روما کو معلوم ہوا تھا کہ اجنبی مہمان جب اس سے گفتگو کرتا تھا تو اسے اس کی آواز کھنکتی کیوں محسوس ہوتی تھی۔ وہ جب آہستہ لہجے میں کچھ کہتا تو اسے اس کی آواز کانوں میں کیوں سنائی دیتی۔ اور اس کے تصور میں خان اصغر کے پہاڑی مکان کا وہ منظر گھومنے لگا جب اجنبی مہمان دونوں طرف سے ہونے والی فائرنگ کے درمیان سیدھا کھڑا تھا اور خان اصغر اور عطا کی گولیاں اس کے ہیولے سے گزر کر ایک دوسرے کو ہی لگی تھیں۔ اس نے ایک دہشت زدہ چیخ ماری اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ لیں۔ خود خان خلیل کا ہاتھ رائفل پر کانپنے لگا تھا۔ اور نورو کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔ لیکن روما کی چیخ کے ساتھ ہی اجنبی مہمان اور اس لڑکی کے ہیولے کہر میں مدغم ہو گئے اور ہوا میں مدھم مدھم سیٹیاں بجنے لگیں۔

وہ تینوں بت بنے کھڑے ہی تھے کہ کسی انسانی چیخ نے انھیں چونکا دیا۔ اور، اور پھر فائرنگ کی دو مسلسل آوازیں سنائی دیں، جس کے ساتھ ہی بہت سے بھیڑیوں کا شور پہاڑ کی مغربی سمت میں گونجنے لگا۔

''شاید شہری مہمانوں پر بھیڑیے ٹوٹ پڑے ہیں۔'' خان خلیل چونک کر بولا۔

''ادھر نہ جایئے، بابا۔'' روما نے چونک کر اسے پکارا۔

''نہیں، ہمارے پاس رائفلیں ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔'' اس نے مغربی سمت میں دوڑتے ہوئے کہا۔ اور روما کے دل میں بھی انسانہ ہمدردی کے جذبات امنڈ آئے۔ وہ بھی باپ کے پیچھے دوڑنے لگی۔

انھوں نے مغربی ڈھلوان کی برف میں دبی جھاڑیوں کے درمیان خونخوار بھیڑیوں کو غرّا غرّا کر کسی پر حملہ کرتے دیکھ کر رائفلیں سیدھی کر لیں۔ نورو نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور وہ یہ دیکھ کر لرز اٹھے کہ کچھ بھیڑیے نصرت کی لاش کو چاروں طرف سے نوچ رہے تھے اور چار

بھیڑیے بار بار رشید پر حملہ کر رہے تھے۔ وہ انھیں بندوق کے کندوں سے مار مار کر بھگا رہا تھا۔ اس کے داہنے کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ چہرے پر کسی بھیڑیے کے پنجے نے زخم ڈال دیا تھا اور خون کی دھار بہہ کر گریباں پر ٹپک رہی تھی۔ ایک ہاتھ کی آستین تار تار ہو گئی تھی۔ اور ہاتھ سے بھی خون ٹپک رہا تھا۔ اندھیرے میں بھیڑیوں کی چمکتی خونخوار آنکھیں بڑی بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔ خان خلیل پرانا نشانہ باز تھا۔ اس نے راشد کے گلے پر دانت مارنے کے لیے جھپٹنے والے بھیڑیے کے سینے پر فائر کر دیا۔ اور وہ ''قیوں'' کی آواز کے ساتھ وہیں گر کر تڑپنے لگا۔ نورو کا خوف کی وجہ سے ہاتھ کانپنے لگا تھا۔ جس سے ٹارچ کی روشنی بھی کانپتی جا رہی تھی۔ مگر روما کا نشانہ بھی خطا نہیں گیا۔ اس نے ایک دوسرے بھیڑیے کو مار گرایا۔

''مسلسل فائر کیے جاؤ، تبھی یہ خوفزدہ ہو کر بھاگیں گے۔'' خان خلیل نے اس سے کہا اور پھر دونوں اندھا دھند بھیڑیوں پر فائرنگ کرنے لگے۔ بالآخر بھیڑیے اپنے شکاروں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ خان خلیل کی ہدایت پر نورو نے بے ہوش اور زخمی راشد کو کاندھے پر اٹھا لیا۔ لیکن نصرت کے جسم کی تو ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے لباس کی چندھیاں دور تک بکھری ہوئی تھیں، اور کہیں کہیں اس کی بوٹیاں بھی۔

☆☆☆☆☆☆

زخم پھر بھی گہرے نہ تھے، لیکن خطرناک ضرور تھے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر کا بیگ بھی ساتھ ہی آیا تھا۔ اور اس میں فوری ضرورت کی ہر قسم کی دوائیں اور انجکشنوں کے علاوہ آپریشن کا سامان بھی موجود تھا۔ اس نے اینٹی سپٹک انجکشن دینے کے بعد راشد کے زخموں کی ڈریسنگ کر دی۔ اسے اس کے ایک کندھے پر تھوڑا سا آپریشن بھی کرنا پڑا۔ روما اور خان خلیل کے دل و دماغ پر کچھ ایسی دہشت سوار تھی کہ وہ ٹھہرے نہیں۔ اپنے کمروں میں جا کر بند ہو گئے۔ کاشانے کے مہمان اپنے کمروں میں بند اس برفستانی رات میں اپنے بستروں میں دبک کر ایسے سوئے

ہوئے تھے کہ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

رات کو تین بجے کے بعد جب راشد کو ہوش آیا تو ڈاکٹر اور مسز زیدی دونوں اونگھ کر سو گئے تھے۔ مگر زلفی اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر زلفی کو دیکھا اور پھر چاروں طرف خوف زدہ نظروں سے کچھ تلاش کرنے لگا۔

''وہ... وہ بھیڑیے؟ اف میرے خدا، اور نصرت بھائی؟'' اس نے اٹکتے الفاظ میں پوچھا۔

''انھیں بھیڑیے کھا گئے۔'' زلفی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مگر تم کیوں گئے تھے وہاں؟'' اس نے غم و غصے سے لبریز آواز میں پوچھا۔

''اچھا ہوتا جوان کی بجائے میں ان بھیڑیوں کا لقمہ بن گیا ہوتا۔'' راشد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' زلفی نے نرم ہو کر پوچھا۔

''زلفی، تمہیں کھو کر میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں...'' وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ مم... مگر... مگر مجھے تم سے محبت ہے۔ بہت۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے زلفی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں کس دبا لیا۔ زلفی کی حسین آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک پڑے۔

''راشد، مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں بہکنے نہیں پائی۔'' وہ گلوگیر آواز میں کہنے لگی۔

''مگر تمہارا سلوک؟''

''نہ جانے کیوں میرے منہ سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جو میں کہنا نہیں چاہتی؟''

''شاید وقار کو ٹھیس لگتی ہو گی۔ مگر، خیر، اب میں تمہارے آڑے نہ آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے منہ پھیرنا چاہا۔ لیکن زلفی برداشت نہ کر سکی۔

Akram Allahabadi

''مجھے معاف کردو، راشد۔ میں نے سچ مچ تم سے اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ مگر؟''

وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اپنی طرف موڑتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولی۔

''مگر کیا؟'' راشد نے مری ہوئی سی آواز میں کہا۔

''مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں تمہاری ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے راشد کے سینے پر سر ٹیک دیا۔

''زلفی۔'' فرط جذبات سے راشد نے کھینچ کر اس کی ریشمیں زلفیں مٹھی میں تھام لیں اور اس کا سر ایک جھٹکے سے اپنے چہرے پر جھکا لیا۔ ان کے لب پیوست ہو گئے۔ اور دھڑکتے دل ہم آہنگ ہو کر ایک دوسرے کی محبت کا اقرار کرنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

واپسی

کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس اجنبی مہمان کے کمرے کی طرف جائے۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کب اپنے کمرے میں واپس آیا ہے۔ مگر نہ جانے کس طرح وہ عجیب بات کاشانے میں اور پھر کاشانے سے نکل کر پوری وادی میں پھوٹ چکی تھی، اس اجنبی مہمان کی بات۔ خان خلیل کی خود تو ہمت ہوئی نہیں، مگر اس کا کوئی نوکر بھی اس موسم بہار کے مہمان کے کمرے میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اور خان خلیل تو یہی سوچتا رہ گیا کہ اس نے ناشتہ بھیجنے سے فائدہ۔ وہ تو پریشان تھا کہ اب کیا ہوگا۔ کیا یہ پورا موسم اس بھیانک پن کے ساتھ گزرے گا۔ روما ایک بار ہمت کر کے اس کے کمرے کے دروازے تک گئی۔ لیکن دروازے پر پہنچتے ہی اسے جھرجھری سی آ گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر اتنی تیز پلٹ کر بھاگی کہ زینے سے گرتے گرتے بچ گئی۔ شام کو پانچ بجنے والے تھے، جب آبادی میں ایک شور سا مچ گیا۔ لوگ مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے سر نکال کر خان نواز کو دیکھ رہے تھے۔ قوی ہیکل بوڑھا خان نواز، چنگیز کی طرح سینہ تانے، ہاتھ میں رائفل لیے، پیدل ہی شورال سے اتر کر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرط غیض سے سرخ ہو رہا تھا۔ راستے میں ملنے والے گھبرا کر اِدھر اُدھر کترا جاتے۔ مگر وہ سیدھا چلا آ رہا تھا، کاشانے کی طرف۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ وہ کئی سالوں کے بعد بستی میں آیا تھا۔ کاشانے کے ہال میں خلیل ابھی نوکروں کو مہمانوں کے لیے قہوہ تیار کرنے کی ہدایت ہی دے رہا تھا کہ اسے دروازے کی طرف سے خان خلیل کی کڑکتی آواز سنائی دی۔

''او ذلیل، خان خلیل۔'' وہ گرجتا ہوا آگے بڑھا۔ ''تو نے آخر میری مرئی ہوئی بیٹی کو بدنام کر ہی دیا، کمینے۔''

Akram Allahabadi

شور سن کر خان خلیل کے نوکر وغیرہ سب باہر نکل آئے ۔مگر کسی کی جرأت نہ ہوئی جو خان نواز کے آڑے آسکتا ۔خلیل بھی سیدھا کھڑا ہوا۔

''وادیٔ قاچار کے بھیڑیے۔اپنی جوان بیٹی کے خون سے ہاتھ رنگ کر بھی تمہیں چین نہیں آیا ہے؟''وہ بھی غصے میں آکر بولا۔

''چپ رہو،خنزیر۔''خان نواز رائفل سیدھی کر کے گرجا۔مگر اسی وقت اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی روما دوڑ کر باپ کے سامنے آگئی۔

''چلاؤ گولی،خان۔چلاؤنا۔تم پر معصوم زندگیوں کا خون حلال ہے۔''

''ہٹ جاؤ،لڑکی۔''خان نواز گرجا۔

''کیوں؟ کیا مجھے دیکھ کر اپنی بیٹی یاد آرہی ہے تمہیں؟''

''چپ رہو۔''وہ دھاڑا۔اور چاہتا ہی تھا کہ ٹرائیگر دبائے ۔مگر نوکروں کو خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر منتشر ہوتے دیکھ کر اس کی بھی نگاہیں اس زینے کی طرف اٹھ گئیں جس سے آج سے ۲۵ سال قبل جب خان نواز کا شانے کا مالک تھا ایک اجنبی مہمان روز اسی انداز سے اترا کرتا تھا۔اور اس کی شکل دیکھتے ہی خان نواز کے منہ سے غصے سے پھین بہنے لگا۔

''تم؟''وہ بڑی بڑی آنکھیں نکال کر چیخا۔''تم ابھی تک زندہ ہو،بے غیرت ۔میں تو سمجھا تھا تم اسی دن مر چکے۔''وہ خان خلیل کو بھول کر اپنی رائفل کی نال اسی موسم بہار کے مہمان کی طرف گھماتے ہوئے بولا۔

لیکن اجنبی مہمان نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔وہ زینے سے اترا اور ہال سے گزرتا ہوا دروازے کی طرف چلنے لگا۔

''ٹھہرو،خنزیر کے بچے ۔آج میں تمہاری بوٹیاں کر کے چھوڑوں گا۔''یہ کہتے ہوئے خان نواز نے اس پر فائر کر دیا۔مگر دروازے میں ایک سوراخ ہو گیا۔اور بس۔

وہ باہر نکل چکا تھا۔خان نواز اس کے پیچھے دوڑا۔باہر نکل کر اس نے دیکھا وہ شوراں

کی طرف جا رہا تھا۔خان نواز بے تحاشہ اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔وہ ہر بار رائفل کا گھوڑا چڑھا کر اس پر فائر کرتا جا رہا تھا۔اور لوگ ادھر ادھر جمع ہو کر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

موسم بہار کا مہمان کہر کی دھند میں ڈوبتا ابھرتا چلا ہی جا رہا تھا۔پھر ایک بار وہ کہر میں اس طرح سما گیا جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

☆☆☆☆☆☆

شام کا جھٹ پٹا ہونے تک پاگلوں کی طرح شورال کا گوشہ گوشہ چھان مارنے کے بعد جب خونخوار خان اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا تو اس کا بوڑھا ملازم اسے اس کیفیت میں دیکھ کر کانپ اٹھا۔وہ بہت غضب ناک تھا۔لیکن مکان کے احاطے میں داخل ہوتے ہی خان نواز کے قدم رک گئے۔اس کی جوان بیٹی راحیلہ اس اونچے چبوترے پر کھڑی ہوئی تھی، جہاں کھڑے ہو کر اکثر خان وادیٔ قاچار کا نظارہ کیا کرتا تھا۔مگر راحیلہ کی نگاہیں دور مشرق میں شورال کی چوٹی پر جمی ہوئی تھیں۔راحیلہ، خان کی آخری بیوی کی اولاد تھی۔اور اگر قاچار کے لوگ اس دیکھ لیتے تو وہ یہی سمجھتے کہ شاہینہ مری نہیں ہے۔کیوں کہ وہ شاہینہ سے بالکل مختلف نہ تھی۔وہی رنگ، وہی خدوخال، وہی ڈیل، وہی قامت۔اور ایک اولاد کو کھو دینے کے بعد خان کو اپنی یہ آخری اولاد بہت عزیز تھی۔اتنی عزیز کہ اس نے اسے ساری وادی کی نظروں سے چھپا کر شورال پر رکھا تھا۔وہ یہیں پیدا ہوئی، اور یہیں جوان ہوئی تھی۔

''کریم۔'' خان نے نوکر کا پکارا۔وہ دوڑ کر قریب آ گیا۔

''یہ یہاں کیوں کھڑی ہے؟'' خان بگڑتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مم... مجھے کیا معلوم خان۔'' وہ جواب دینے میں ہکلایا۔

''مجھ سے سچ بولو۔ورنہ میں تمہارے بوڑھاپے پر کوئی رحم نہ کروں گا۔''

''وہ روز ہی اس وقت اس جگہ کھڑی ہو کر مشرقی چوٹی کو گھورا کرتی ہیں، خان۔''

بوڑھے نے بتایا۔

''ہُم۔'' یہ کہہ کر وہ بھی چبوترے کی طرف چل دیا۔مگر اس وقت جیسے ہی اس کی نگاہیں شورال کی مشرقی چوٹی کی طرف اٹھیں، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ، موسم بہار کا مہمان، دور شورال کی اس چوٹی پر کھڑا ہوا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایستادہ پتلے کی طرح کہر کی دھند میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

''اور کیا دیکھا ہے تم نے؟'' خان نے پلٹ کر نوکر سے پوچھا۔

''کک... کچھ نہیں۔''

''بوڑھے، خبیث۔'' خان نے نوکر کی گردن دبوچ لی۔ ''بتاؤ، ورنہ گردن دبا دوں گا۔''

''رات ہو جانے دیجیے۔ خود دیکھ لیجیے گا۔ میں نہیں بتا سکتا۔'' بوڑھے نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ خان نے اسے جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا خونخوار نظروں سے اپنی دوسری بیٹی کو گھورتا رہا۔ پھر اس کی رائفل کی نال اٹھی، مگر کریم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آج اس کی بیسویں سالگرہ ہے، خان۔ کم از کم آج تو اس پر رحم کیجیے۔'' اس نے استدعا کی۔

خان ٹرائیگر نہ دبا سکا۔ نہ جانے کیوں؟ اس نے رائفل برآمدے میں کھونٹی پر ٹانگ دی اور خود اندر جا کر گدے دار نشست پر کسی کٹے ہوئے لٹھے کی طرح گر پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

اس کی آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ پلنگ پر بڑا بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ رائفل اس کے سرہانے تھی۔ کریم باہر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اچانک آدھی رات کے سناٹے میں خان کے پاس والے کمرے سے ایک چیخ سنائی دی۔ بالکل ویسی ہی، جیسی اس وقت شاہینہ کے حلق سے

نکلی تھی، جب خان کی پہلی کلہاڑی اس کے سر پر پڑی تھی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور اس کا ہاتھ رائفل پر چلا گیا۔ چیخ کی آواز راحیلہ کے کمرے سے ہی آئی تھی۔ خان کو دروازے سے باہر آنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے دیکھا راحیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی احاطے سے باہر جا رہی تھی۔

''راحیلہ۔'' خان حلق پھاڑ کر چیخا۔ لیکن راحیلہ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

''ٹھہر جا، ورنہ گولی مار دوں گا۔'' وہ آگے بڑھ کر گرجا۔ لیکن راحیلہ کی نگاہیں اس وقت استرا خان کی بلندیوں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اس طرح سر سیدھا کیے چل رہی تھی، جیسے خواب میں چل رہی ہو۔

''را...حی...لہ...'' خان نے پھٹتے ہوئے پھیپھڑوں سے آواز نکالی۔ ساتھ ہی اس کے رائفل کی نالی سے ایک شعلہ نکلا۔ اور راحیلہ کے حلق سے ایک چیخ۔

''یہ کیا کیا، بے رحم، خان، تم نے؟'' کریم چیخ کر دوڑ پڑا۔ مگر اس سے پہلے خان نواز اپنی بیٹی کی لاش کے پاس پہنچ چکا تھا۔ وہ چیخ مار کر اس پر جھک گیا اور اسے سینے سے لپٹا کر رونے لگا۔

''اسے نیچے رکھ دو، خان۔ تمہارے خونی ہاتھ اس قابل نہیں کہ اس معصوم کو اب چھو سکیں۔'' خان کو پشت سے کریم کی آواز سنائی دی۔

''مت چیخو، کمینے۔ میں اپنی بیٹی کو رخصت کر رہا ہوں۔'' خان، راحیلہ کی لاش کو ایک بار گلے سے لگا کر بچوں کی طرح رو پڑا۔

''ہٹ جاؤ، خان۔'' کریم کی بوڑھی آواز بھی گرج میں تبدیل ہو گئی۔

اور خان نے پلٹ کر دیکھا اس کی رائفل کریم کے ہاتھ میں تھی۔ کریم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ زندگی میں وہ کبھی اتنا غضب ناک نہیں ہوا تھا۔

''خونی بھیڑیے، میرے سامنے تم نے اپنی دو معصوم جوان بیٹیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ ان بیٹیوں کو جنھیں میرے ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے پیار سے پالا تھا۔ میں آج

Akram Allahabadi

تمہیں جیتا نہ چھوڑوں گا۔بھیڑیوں پر رحم نہ کرنا چاہیے۔" کریم ٹرائیگر پر انگلی رکھ کر چیخا۔

"کریم۔" خان چلایا۔

مگر دوسرے لمحے خان کی لاش بیٹی کے پاس ہی گر کر تڑپنے لگی۔کریم نے رائفل پھینک دی۔اور دوڑ کر خان نواز کے قدموں سے لپٹ پڑا۔

"میرے آقا،میرے خان۔" وہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

اور ٹھیک اسی وقت کاشانے کے تمام مہمان اور خان خلیل اور روما،اوپری منزل کے استرا خان کے ڈھلوان کی طرف والے چھجے پر کھڑے،استرا خان کی برفیلی سطح پر پھیلے ہوئے اندھیرے میں کچھ گھور رہے تھے۔آج دو روحوں کا ملاپ ہونے والا تھا۔آج وہ بیس سال کی ہو گئی تھی۔وہ مدت جو اسے بچھڑ جانے والے محبوب کے انتظار میں دوبارہ اس دنیا میں آ کر کاٹنی پڑی تھی۔اچانک ہواؤں میں ایک عجیب سی ترنم خیز گونج سنائی دینے لگی۔اور استرا خان کے بھیڑیے چیختے چیختے چپ ہو گئے۔

نارچوں کی روشنیاں دور تک چمکیں اور اس چوٹی پر جو لاجوردندی کے ڈھلوان کے اوپر واقع تھی۔دو سفید سفید سے سائے کہر سا بھر کر کہر میں مدغم ہو گئے۔آج انھیں وہ بھیانک چیخیں سنائی دیں اور نہ وہ پراسرار صدائے بازگشت،جو استرا خان کی بلندیوں سے کسی کو روز بلایا کرتی تھی۔ہواؤں میں وہ خوش گوار ترنم دیر تک گونجتا رہا۔

کہیں دور...بہت دور...نیلے آسمان کی نظر نہ آنے والی بلندیوں پر دو روحوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے ملاپ کی شہنائیاں بج رہی تھیں اور شاید یہ اسی کی گونج تھی۔

☆☆☆☆☆☆

سویرے ڈرتے ڈرتے جب خان خلیل، روما، ڈاکٹر زیدی، ان کی مسز اور زلفی، اجنبی مہمان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ سوٹ کیس، جو موسم بہار کا مہمان اپنے ہاتھ میں لے کر استرا خان کی پہاڑیوں سے آیا کرتا تھا، ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ کیوں کہ اس پر باریک انگریزی حروف میں لکھا تھا۔

پروفیسر شہاب پرویز

اور جب ڈاکٹر نے اسے کھولا تو تقریباً سب ہی کی چیخیں نکل پڑیں۔ اس میں کھوپڑی سمیت ہڈیوں کا ایک انسانی پنجر ٹوٹو ہوا رکھا تھا۔

وہ بھاگ کر باہر نکل آئے۔ اور خان خلیل نے بڑے زور سے اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے اس میں قفل ڈال دیا۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر وادیٔ قاچار کے سیاحوں والے نقشے میں لاجوردندی کی نیلی لکیر کو غور سے دیکھ رہا تھا، جو آگے چل کر سر جوندی میں مل گئی تھی۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

Akram Allahabadi